جلد ۹۳ — مارچ ۱۹۸۰ء — عدد ۱

ماھنامہ

ترجمان القرآن

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

جو لوگ خُدا کی راہ میں مارے جائیں انھیں مُردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تمھیں اُن کی زندگی کا شعور نہیں۔ (القرآن)

پروفیسر عبدالحمید صدّیقی

——— اپنی تحریروں کے آئینہ میں

مُرتّبہ : محمّد اکرام صدّیقی

یہ کتاب جناب پروفیسر عبدالحمید صدّیقی مرحوم کے سوانح اور افکار کا مجموعہ ہے۔ کتاب چار حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصّہ مرحوم کے سوانح حیات پر مبنی ہے۔ دُوسرا حصّہ مرحُوم کے قلم سے لکھے گئے ماہنامہ ترجمان القرآن کے اداریے" اشارات" میں سے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ تیسرے حصّے میں آپ کے مضامین کا انتخاب پیش کیا گیا ہے اور آخری حصّے میں آپ کی تصانیف کا تعارف درج ہے۔ اِس لحاظ سے یہ کتاب محض ایک سوانح ہی نہیں بلکہ مرحُوم کی نگارشات کا ایک اِنتخاب بھی ہے۔

لکھنے والوں میں جناب سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی مرحُوم، جناب مولانا نعیم صدّیقی، جناب پروفیسر اسرار احمد سہاروی، جناب رحمان شاد، جناب عطش دُرانی، جناب محمّد اقبال صدّیقی اور دیگر حضرات شامل ہیں۔

قاضی پبلیکیشنز۔ ۱۲۱۔ ذُوالقرنین چیمبرز، گنپت روڈ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۱	مارچ ۱۹۸۰ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ	جلد ۹۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر ۴۱۱۰۱۶ — ۴۱۰۳۱۶

زر سالانہ بیس روپے - فی پرچہ ۲/ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: سید حسین فاروق مودودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اس وقت روس کے حلقہ ہائے اثر اندازی (LABBIES) ہمارے اندر مختلف طریقوں سے کام کر رہے ہیں، ہر ایک کی اپنی مفروضہ لائن ہے۔ یہ سارے حلقے ہمیں خوشی خوشی روس کا شکار بننے کے لیے تیار کرنے کے ساتھ پاکستان کے نظریہ اساسی اور ریاست کے اسلامی مقاصد سے دور کرنے کے درپے ہے۔

ایک عنصر کہتا ہے کہ ہمیں غیر جانب داری اختیار کر لینی چاہیے۔ حالانکہ سیاسی و فوجی لحاظ سے ہم پہلے ہی سے غیر جانب دار ہیں۔ البتہ ایک اعتقادی، نظریاتی اور مقصدی ریاست کی حیثیت سے ہمارا وجود روس کی سوشلسٹ آئیڈیالوجی سے ٹکراتا ہے۔ اس عنصر کو یہ اندازہ نہیں کہ روسی لغت میں غیر جانب داری اور غیر وابستگی کے کیا معنی ہیں۔ پاکستان اگر کیوبا والی پوزیشن اپنا لے، اور جب تک ایسا نہ ہو کم سے کم روس کے بارے میں بھارت کا سا رویہ اختیار کر لے تو شاید اسے غیر جانب داری کا سرٹیفکیٹ مل جائے۔

ایک عنصر کہتا ہے کہ فوراً روس سے دوستی قائم کر لینی چاہیے۔ یہ عجیب صورت ہو گی کہ جب کوئی بڑی قوت آرمرڈ کاروں، ٹینکوں، طیاروں اور میزائیلوں سے لیس ہو کر آپ کی سرحد پہ آ کھڑی ہو تو آپ پیغام بھجوائیں کہ ہم تو آپ کی دوستی کو ترس رہے تھے۔ یہ دانشور عنصر گویا لومڑیوں کی سی عیاری کے ساتھ ساری قوم کو خرگوش بنا کر ریچھ یا بھیڑیے سے دوستی کرانے نکلے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر صیاد کو سنگلاخ راستے سے شکار کی طرف بڑھنے کے بجائے دوستی کی صاف ستھری سڑک

بنی بنائی مل جائے اور شکار ہونے والے خود ہی حاضر ہو رہے ہوں تو یقیناً اس کا دردِ سر بڑی حد تک کم ہو جائے گا۔ مگر یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ خرگوشوں پر تو جو شفقت ہوگی وہ ہوگی ہی — مگر لومڑیانِ کرام کا حشر بھی کچھ اچھا نہیں ہوگا۔

دوستی ہو جانے کے بعد اگر روس یہ پیش کش کرے کہ میرے فوجی اور سول اور ٹیکنیکی ماہرین یہاں رہ کر پاکستان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، یا اگر وہ چاہے کہ سارا صنعتی مال اسی سے خریدا جائے اور خام مال اسی کو بیچا جائے، یا اگر وہ تقاضا کرے کہ مجھے کابل سے کراچی تک کا راستہ درکار ہے، یا مکران کے ساحل پر مجھے بندرگاہ بنانی ہے - یا پاکستان کے دستور سے اسلامیت کے اثرات کو نکال دیا جائے - یا فلاں فلاں کمیونسٹوں کو خاص خاص پوزیشنز دی جائیں، یا سوشلزم کے خلاف لٹریچر شائع نہ ہو تو کیا آپ مضبوطی سے انکار کر سکیں گے؟

ایک دوستی کا حشر تو ہمارے سامنے ہو چکا ہے - افغانستان دوست ہی تو تھا، وہی دوست ملک آج روس کے ہاتھوں برباد ہو رہا ہے - کل جب ہمارے ساتھ بھی دوستی معاشقے تک جا پہنچے گی تو وہی عذر سامنے رکھ کر کہ مغربی رقیب مداخلت کر رہے ہیں یا چین خلل انداز ہو رہا ہے، درۂ خیبر اور بولان سے سرخ فوج واہگہ تک جا پہنچے گی - احسان یہ رکھا جائے گا کہ ہم تمہیں بچانے آئے ہیں اور عملاً کرم یہ ہوگا کہ پورے پاکستان کو روند کر کچل دیا جائے گا - اور کٹھ پتلی حکومتیں ٹوٹتی بنتی رہیں گی اور تمام در و بست ہاتھ میں لے کر آبادی کو لونڈی غلام بنا کے استعمال کیا جائے گا - بلکہ یہیں سے بیگاریوں کو بھرتی کر کے روس میں پہنچا دیا جائے گا، اور جو یہاں رہیں گے اُن کو بھاری کاموں میں جوت کر قدغن لگا دی جائے گی کہ کوئی آواز بلند نہیں کر سکتے - اخبار نویس اور ادیب اور مصنف جو مزے آج کر رہے ہیں کہ جو چاہا لکھ دیا اور لیڈروں نے جو چاہا کہہ ڈالا اور ذرائع ابلاغ کے کارپرداز جیسی چاہیں اثر اندازی کرتے رہیں، شعر و ادب کے دائرے میں فن کار اپنی مرضی کے نکتے بیان کرتے رہیں — یہ حالت باقی نہیں رہے گی۔ بنیادی حقوق کے یہ چوچلے، جمہوریت کے یہ مطالبے، انتخابات کا یہ شوق، سنسر شپ سے یہ بیزاری، سیاسی اختلافات پر نظر بندیوں اور سزائے قید اور گولی مارنے کے خلاف شدید ردعمل، ان میں سے کچھ باقی نہیں رہے گا۔ سلامتی کا راستہ پھر تو پنجابی کے محاورے کے مطابق یہی ہوگا کہ "دڑ وٹ، دیہاڑے کٹ" یعنی دبک جاؤ اور وقت گزارو۔

ایک فریق اور بھی ہے جو کہتا ہے کہ روس "آ رہے ہی آ رہے" یہ وہ لوگ ہیں کہ کچھ عرصے سے پوری قوم سے، حکومت سے، فوجیوں سے، اسلامی عناصر سے، بلکہ خود اسلام سے اس درجہ ناراض ہیں کہ اپنے اندر ولیسا روایتی انتقام رکھتے ہیں کہ "بیٹا مرے تو مر جائے مگر بہو کا مان ٹوٹے"۔ ان کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص گھریلو معاملات سے بگڑ کر اٹھے اور پھر باہر جا کر ایسی قوتوں کو ناش کرے جو اُس گھر کو ——— ماں باپ، بہن بھائیوں ——— سب کو تباہ کر دے جس میں اُس کی بے دفری ہوتی۔ انہیں دین و ملت و وطن سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ یہ نو سرحد پر جا کر جارحیت کار کے لشکریوں کا خیر مقدم بینڈ باجے سے کریں گے اور اُن سب کو ہار پہنا کر لائیں گے، پھر نو وارد کی خوشامد اور خدمت کر کے ایک ایک مقامِ انتقام کی نشاندہی کریں گے۔ تاریخ میں اس سے بڑھ کر ذلت کا کوئی دوسرا مقام شاید ہی ہو۔ اور ایسے لوگوں کا اپنا انجام ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔

پھر پکے کمیونسٹ اور ادھ کچرے کمیونسٹ ہیں جو عام بے دین اور سیکولر حلقوں سے بھی حمایت حاصل کرتے ہیں، یہ لوگ ایک طرف افغانستان میں رُوسی جارحیت کا سارا الزام امریکہ اور چین کی مداخلت کاری پر رکھتے ہیں، دوسری طرف یہ خوف دلاتے ہیں کہ رُوس جیسی سپر پاور کا کیا مقابلہ، اور تیسری طرف یہ لوگ یہ کہتے ہیں اگر فوجی آمریت کی جگہ رُوسی آمریت آ جاتی ہے تو عوام کے لیے کون سا بڑا فرق واقع ہوتا ہے ——— ہاں البتہ روس آئے گا تو جاگیرداروں اور علماء اور لیڈروں اور بعض مصنفین کا اس طرح صفایا کرے گا کہ بس غریبوں کے تمام دلدر دُور ہو جائیں گے۔

اس مشہور دانشور طبقے کی یہ ساری باتیں محض فریب کارانہ باتیں ہیں۔ قوم کے خواص اور غریب تو الگ رہے، ایک دن خود یہ دانش ور طبقے انسان کش اشتراکی جبریت کے خلاف چیخنا چاہیں گے اور اس جرم پر اُن سے قلم و قرطاس چھین کر انہیں کسی پاگل خانے یا کینسر وارڈ میں پہنچا دیا جائے گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ خود رُوس کے سائبیریائی خطے میں اُن کو جگہ دی جائے۔

ان لوگوں کا حال ہانکا کرنے والے اُن فرومایہ لوگوں کا ہے جو شکار کو جمع بھی کرتے ہیں، اس کو افیون بھی کھلاتے ہیں، اس میں بزدلی پیدا کرتے ہیں اور پھر صیاد کو دعوت دیتے ہیں کہ آئیے سارا کام تیار ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ اُن کا مرتبہ وہی ہے جو نظامِ بردہ فروشی کے لیے مٹھائی کھلا کر بچوں کو پکڑنے والے ماہرین کا

ہوتا ہے۔

مگر روسی کمیونزم و سوشلزم کو جو بڑی چوٹ افغانستان میں لگی ہے اور جس کے احوال دنیا بھر کے سامنے آگئے ہیں اور جس کی حقیقت کے زندہ ترجمان کئی لاکھ کی تعداد میں مہاجر کیمپوں میں پڑے ہیں، اس کے بعد پاکستانی کمیونسٹوں کے پاس یہی حربہ رہ گیا ہے کہ یا تو وہ موجودہ فوجی حکومت کے خلاف پوسٹر بازی اور سرگوشی سے کام لیں، یا انتخابات کا راگ الاپ کر قوم کی توجہ وقت کے فریضۂ جہاد سے ہٹا دیں۔

یہ اہم ترین عنصر اس وقت نشر و اشاعت اور ابلاغ کے اداروں میں مورچے لگائے ہوئے، انتظامیہ محکمہ تعلیم اور محکمہ خارجہ میں محاذ آرا ہے، کتنے لسانی اور ثقافتی ادارات میں خندقیں کھودے بیٹھا ہے، باہر بیٹھ کر کام کرنے والے ساتھیوں کی فتنہ طرازیوں سے اس کا ربط قائم ہے، یہاں کے روسی اور دوسرے بیرونی سفارت خانوں سے اس کے پُراسرار تعلقات ہیں۔ خاص خاص لوگ روسی پشت پناہی سے عالمی سفروں پر جلتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو ماسکو سے ان کی ترجمہ کردہ کتابوں کی بھاری رائیلٹی آتی ہے۔ یوں بھی موقع بہ موقع ان حلقوں میں پراسرار ہُن برستا رہتا ہے۔ پھر یہ لوگ خوشامد کے ماہر ہیں، افسروں کو خوب مسکہ لگا سکتے ہیں۔ اسلام کے نعرے بلند کر سکتے ہیں۔ ایکٹروں کی طرح کوئی سا پیرایہ اختیار کر سکتے ہیں۔ درحقیقت روسیوں کی یہ فکری سفر مینا پارٹی ہے جو وقت آنے پر آگے آگے سڑک یا پل تیار کرتی ہے۔

اصلاً تو یہ ذمہ داری حکومت کی ہے کہ وہ ان عناصر کی کڑی نگرانی کرے اور حساس پوائنٹس سے ان کو ہٹا کر اِدھر اُدھر کر دے، اُن کو خوشامد اور بہروپیے پن کی آڑ میں اثر انداز نہ ہونے دے۔ ادارات سے اُن کا تسلط توڑے۔ جیسا کہ حکام کے بیانات اور تقاریر میں کہا بھی جاتا ہے، مگر عملاً اب تک کچھ ہوا ہوا یا نہیں۔ بعد کی ذمہ داری عوام کی ہے کہ حکومت اگر کچھ نہ کر سکے تو ایک تو عوام اُن کو پہچانیں۔ اُن کی لسٹیں مہیا رکھیں اور ہر ایک کی خاص کارکردگی کی رپورٹ مکمل کریں۔ اُن کی ہر بحث کا مسکت جواب دیں۔ اور کسی وقت اگر یہ سمجھا کہ کوئی غلط کارروائی شروع کر دیں تو اُن کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔

اُردو کی بحث کے متعلق مجھے ایک ایسی بات کہنی ہے جسے بہت کم لوگ توجہ دے سکے ہوں گے۔

تاریخ میں یہ ایک ایسا لمحہ ہے کہ روس باہر سے وسائل، اسلحہ اور پروپیگنڈہ کی قوتوں سے خوب آراستہ ہونے کے باوجود نظریاتی محاذ پر داخلی شکست سے دوچار ہے۔

ایک طرف یہ حقیقت دنیا پر اچھی طرح آشکار ہو چکی ہے کہ سوویت کمیونزم جنگی اور خلائی لحاظ سے کتنا ہی ترقی کر گیا ہو، عوامی ضروریات سے تعلق رکھنے والی معیشت میں وہ اپنے فلسفیانہ تصورات کے لحاظ سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ مارکس کے نظریات پر مبنی یہ تخیل کہ بورژوا آمریت معاشی سرگرمی کی رفتار کو سرمایہ دارانہ نظام سے بڑھ کر تیز کر دے گی اور طبقاتی تفاوت مٹنے کی وجہ سے قدرِ زائد (SURPLUS VALUE) کی تقسیم اتنی منصفانہ ہوگی کہ عوام دوسرے معاشروں سے زیادہ خوشحال ہو جائیں گے۔ آج ماسکو کے چوراہے میں کرچی کرچی ہوا پڑا ہے......

دوسری طرف اشتراکیت کا یہ تاریک پہلو بھی ہر کسی کے سامنے آگیا ہے کہ سُرخ نظام کا چلن انسانی حقوق کو کچلنے والی مکمل جبریت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ بنیادی حقوق کی پامالی کے خلاف دانشوروں کا وہی طبقہ صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہو گیا ہے جو اشتراکی انقلاب کا ہراول دستہ تھا۔ پیسٹرنیک سے سخاروف تک کتنے ہی مصنف اور ادیب اور سائنس دان حکومت کا نشانۂ عتاب بنے، کتنوں نے ملک چھوڑا۔ اور کتنے کھلے مظاہرے کرنے کی وجہ سے جیلوں اور پاگل خانوں میں ہیں۔ یہ ہمارے اپنے سُرخ دانشوروں کے مغز مارنے کا مسئلہ ہے۔ کم سے کم اُن کے پیش کردہ خوبصورت ادبی نعرے اور اشتراکیت کی عکاسی کرنے والے افسانے اور انقلابی نظمیں، سب کے معنی ختم ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں افغانستان میں جو فضیحتا نام نہاد مساواتِ انسانی اور عدلِ معاشی کے نظام کا ہوا ہے اس نے دنیا جہان کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ افراد کے قتل مقاتلے کے علاوہ حکومتوں کا بار بار خونیں عمل سے بدلنا اور ہر بار اشتراکیت کے کسی آلۂ کار خادم کا ملیامیٹ ہو جانا۔ پھر چھوٹے سے ملک میں بھاری فوج اُتار دینا اور اس فوج کا بموں اور راکٹوں سے غریب لوگوں کی بستیوں کو تباہ کرنا، انسانوں کو زہریلی گیس کا شکار بنانا اور اس ساری کارروائی کے لیے بہانہ یہ گھڑنا کہ بعض مداخلت کار قوتوں کی وجہ سے روس کو فوجی مداخلت کرنی پڑی ہے۔ لیکن اس کی فوجی کارروائی کا نشانہ کوئی مداخلت کار نہیں۔ افغانستان کی بے گناہ آبادی بنی ہے، عورتیں اور بچے تباہ ہو رہے ہیں اور خود افغانستانی فوج بھاگ بھاگ کر مجاہدین سے مل رہی ہے۔ اس صورتِ حالات کی گواہی یہ ہے کہ اصل مداخلت کار

خود روسی ہیں۔ پھر وہ مجاہدین کا قلع قمع کرنے کے لیے اُن کو ڈاکو اور قاتل قرار دیتے ہیں، حالانکہ ڈاکوؤں اور قاتلوں کا کردار خود اُن کا اپنا ہے۔

پھر اس وقت لاکھوں کی تعداد میں جو مہاجرین پاکستان میں پڑے ہیں اُن سے پوچھا جا سکتا ہے کہ وہاں اُن کو کیا پیش آیا اور انہوں نے کس کو مداخلت کار دیکھا۔

غرض کہ روس کا کردار اس وقت "انتہائی ظلم بلا دلیل" کا ہے۔

تانہ سانحہ افغانستان کے خلاف جب صومالیہ، ارٹیریا اور جنوبی یمن میں روسی مداخلت کا جائزہ لیا جاتا ہے تو جہاں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ روس کا یہ توسیعی عمل ہے، وہاں یہ راز بھی خوب عیاں ہو جاتا ہے کہ اس کے عالمی کردار میں مجموعی طور پر مسلم دشمنی بہت مؤثر حصّہ رکھتی ہے۔

تیسری چیز وہ نہایت اہم شکست ہے جو فلسفۂ اشتراکیت کو اپنی اساسی فکر کے محاذ پر منڈلاتی دکھائی دے رہی ہے۔ وہ یوں کہ اشتراکیت جس ملحدانہ مادّیت اور جدلی تاریخ کے نظریے پر کھڑی کی گئی تھی اس کا ایک اصل الاصول یہ تھا کہ مذہب کوئی سحرکی اور تعمیری قوت نہیں، بلکہ ایک افیون ہے۔ اہل مذہب عوام کو اس افیون کے نشے میں بدمست رکھتے ہیں اور ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں، لہٰذا اُن کا قلع قمع کر دینا چاہیے۔ لینن کا مشہور مقالہ (ON RELIGION) اس سلسلے میں خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہے۔ اشتراکی فلسفہ کے رُو سے مذہب کا پارٹ تاریخ میں ہمیشہ رجعت پسندانہ رہا ہے۔ اور اس کا چلن صرف جاگیردارانہ دور تک ممکن تھا۔ سائنس، صنعت اور ٹیکنالوجی کے دَور میں مذہب کا ایک تاریخی قوت بننا ناقابلِ تصور ہے۔ اسی لیے اپنے اردگرد کی مسلم ریاستوں کو فتح کرنے کے بعد روسیوں نے اسلامی ادارات کو ختم کر دیا۔ روایات و اقدار کو ملیامیٹ کر دیا۔ مسجدوں کو بند کیا، پردہ کا خاتمہ کیا، نیز نہایت سختی سے اسلام کے تبلیغی عمل کو ختم کر دیا۔ یہاں تک کہ نئی نسلوں کو پچھلی نسل کے دائرہ اثر سے نکال لیا۔ اور رسم الخط کی تبدیلی سے پرانے دینی لٹریچر کو مسلمانوں کے لیے بے کار کر کے اُن میں فلسفۂ الحاد کو پھیلا دیا۔ اب گویا روسی اشتراکیوں کے نزدیک اسلام کا چمن ہمیشہ کے لیے ویران ہو گیا۔

مگر آج جو صورتِ حالات روس کے سامنے آئی ہے کہ پاکستان کے علاوہ مصر اور سوڈان ترکی اور ایران، انڈونیشیا اور ملائشیا ہر طرف سے اسلامی تحریکات انقلابی لہریں اُٹھا رہی

ہیں۔ خصوصاً ایران میں تو اسلامی فکر و جذبہ کے زیر اثر عوام نے بادشاہت کے بڑے مضبوط تخت کو اُلٹ دیا ہے۔ یہ صورتِ واقعہ سرے سے فلسفہ اشتراکیت کی جڑ کاٹ دینے والی ہے۔ مزید ستم یہ ہوا کہ روسی سامراج کا لقمہ بننے والی مسلم ریاستوں میں بھی دبا دبا اسلامی جذبہ اس طرح محسوس ہو رہا ہے جس طرح گھاس کے نیچے نیچے پھیلتا ہوا پانی چاندنی میں چمکتا ہے۔ اسلام کی عالمی تحریک جس نے پہلا انقلابی ڈرامہ ایران میں سٹیج کیا ہے۔ اُس کی تابانی و لمعانی میں رُوس کو اپنے ہاں گھاس کے نیچے کا متحرک پانی دکھائی دینے لگ گیا ہے۔ گویا معاملہ اب محض نظریاتی شکست کا نہیں بلکہ ایران میں بھی، پاکستان میں بھی، اور جیسے کہ حالات نے گواہی دے دی ہے افغانستان میں بھی — دوسری طرف مصر، سوڈان اور ترکی اور شام و عراق میں بھی اسلامی تحریک مزاحم قوتوں سے ٹکر لیتی ہوئی بڑھ رہی ہے، روس کے سامنے اب ایک عملی جوابی انقلاب کا بھاری سیلاب موجزن ہے۔ یہ ایمانی سیلاب ٹینکوں اور میزائیلوں اور خلائی گاڑیوں کے زور سے رُکنے کا نہیں ہے۔ گویا رُوس کے اشتراکی نظام اور فلسفے کو براہ راست ایک ایسا خطرہ پیش آگیا ہے جس کا تجربہ اُسے مغربی سرمایہ دار ممالک کی طرف سے کبھی پیش نہ آیا تھا۔ وہ تو اس وقت ہڑبڑا کر اور گھبرا کر فسل کھڑا ہوا ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے کسی کو یکایک دَورہ پڑ جائے۔

وہی مذہب جسے رُوس کا دینِ مادیت افیون کہتا ہے اُسی نے افغانستان کے بچے بچے کو ایک راکٹ اور میزائیل بنا دیا ہے۔ اور جانبازوں کے خون کی موجیں اُسے کسی طرف قدم بڑھانے نہیں دیتیں۔ اوّل تو افغانستان ہی کا کمبل اُسے نہ چھوڑے گا، اگر اور آگے بڑھے تو ایک طرف ایران اور دوسری طرف پاکستان دونوں کی اسلامی تحریکات اُسے بے بس کر کے رکھ دیں گی۔ بنا بریں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ:

احمق ہیں وہ لوگ جو اس وقت رُوس سے ڈر کر اور دب کر بات کرنا چاہتے ہیں۔

اِس وقت جو فیصلہ کُن مرحلہ اشتراکیت کو درپیش ہے، اُس میں اگر دُنیا بھر کے مسلمان ایران اور افغانستان کی طرح اسلامی انقلاب کی تحریک کو آگے لے چلنے کا فیصلہ کریں، اور پھر اگر رُوسی جارحیت کا سامنا کرنا پڑے تو افغانستانی مجاہدین کی طرح ایسا بھرپور کردار ادا کریں کہ (باقی بر صفحہ ۷۰)

(گذشتہ سے پیوستہ)

تذکرۂ انبیاء

علیہم السلام

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

باب اوّل ——— قصۂ آدم علیہ السلام

فصل ۷، ۸

فصل ۷

آدمؑ، فرشتے اور ابلیس

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ
إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ
خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓا أَتَجْعَلُ
فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَ
يَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ
بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّيٓ
أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَ
عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا
ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَٰٓئِكَةِ
فَقَالَ أَنۢبِـُٔونِي بِأَسْمَآءِ
هَٰٓؤُلَآءِ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ۝
قَالُوا سُبْحَٰنَكَ لَا عِلْمَ
لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَآ ۖ إِنَّكَ
أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝
قَالَ يَٰٓـَٔادَمُ أَنۢبِئْهُم
بِأَسْمَآئِهِمْ ۖ فَلَمَّا
أَنۢبَأَهُم بِأَسْمَآئِهِمْ

پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب
نے فرشتوں سے کہا تھا کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ
بنانے والا ہوں۔" انھوں نے عرض کیا "کیا آپ
زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس
کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا؟
آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے
تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔" فرمایا "میں جانتا
ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔" اس کے بعد اللہ نے
آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے پھر انہیں
فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا "اگر تمہارا
خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام
بگڑ جائے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ۔"
انھوں نے عرض کیا "نقص سے پاک تو آپ
ہی کی ذات ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے
ہیں، جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔ حقیقت
میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا
کوئی نہیں۔" پھر اللہ نے آدم سے کہا "تم انہیں

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۔	"ان چیزوں کے نام بتاؤ" جب اس نے ان کو سارے نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں۔ جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے بھی میں جانتا ہوں۔"
وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ڭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۔	پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ "آدم کے آگے جھک جاؤ" تو سب جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہوگیا۔
وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۔	پھر ہم نے آدم سے کہا کہ "تم اور تمھاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا ورنہ ظالموں میں شمار ہوگے۔"
فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۔	آخرکار شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انھیں اس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے۔ ہم نے حکم دیا کہ "اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے۔"
فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۔	اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی، جس کو اس کے رب نے قبول کرلیا، کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔
قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ	ہم نے کہا کہ "تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔" پھر

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (البقرہ۔ آیات ۳۰ تا ۳۹)

جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

شرفِ انسانی اور پستیٔ ابلیس

یہ الفاظ (خَلَقْتُ بِیَدَیَّ۔ ص آیت ۷۵) تخلیق انسانی کے شرف پر دلالت کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ بادشاہ کا اپنے خدام سے کوئی کام کرانا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایک معمولی کام تھا جو خدام سے کرا لیا گیا۔ بخلاف اس کے بادشاہ کا کسی کام کو بنفس نفیس انجام دینا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ایک افضل و اشرف کام تھا۔ پس اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جسے میں نے خود بلاواسطہ بنایا ہے اس کے آگے جھکنے سے تجھے کس چیز نے روکا؟

دونوں ہاتھوں کے لفظ سے غالباً اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس نئی مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی شانِ تخلیق کے دو اہم پہلو پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسے جسم حیوانی عطا کیا گیا، جس کی بنا پر وہ حیوانات کی جنس ہی سے ایک نوع ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے اندر وہ روح ڈال دی گئی جس کی بنا پر وہ اپنی صفات میں تمام ارضی مخلوقات سے اشرف و افضل ہو گیا۔

آدم کو سجدہ کرانے کا مفہوم

سورۂ بقرہ میں حکم سجدہ کا ذکر جن الفاظ میں آیا ہے ان سے شبہ ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم صرف آدمؑ کی شخصیت کے لیے دیا گیا تھا، مگر یہاں وہ شبہ دور ہو جاتا ہے۔ یہاں جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آدم کو جو سجدہ کرایا گیا تھا وہ آدمؑ ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ نوعِ انسانی کا نمائندہ فرد ہونے کی حیثیت سے تھا۔ اور یہ جو فرمایا کہ ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی پھر تمہیں صورت بخشی، پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے پہلے تمہاری تخلیق کا منصوبہ بنایا، اور تمہارا مادہ آفرینش تیار کیا، پھر اس مادے کو انسانی صورت عطا کی۔ پھر جب ایک زندہ انسان کی حیثیت

سے آدمؑ وجود میں آگیا تو اسے سجدہ کرنے کے لیے فرشتوں کو حکم دیا۔ اس آیت کی یہ تشریح خود قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بیان ہوئی۔ "تصور کرو اس وقت کا جب کہ تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کرلوں اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔"

خلافتِ آدمؑ کے متعلق فرشتوں کا اشکال

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (البقرہ - آیت ۳۰)

انھوں نے عرض کیا: "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔"

یہ فرشتوں کا اعتراض نہ تھا، بلکہ استفہام تھا۔ فرشتوں کی کیا مجال کہ خدا کی کسی تجویز پر اعتراض کریں۔ وہ "خلیفہ" کے لفظ سے یہ تو سمجھ گئے تھے کہ اس زیرِ تجویز مخلوق کو زمین میں کچھ اختیارات دیے جانے والے ہیں، مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ سلطنت کے اس نظام میں کسی بااختیار مخلوق کی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے، اور اگر کسی کی طرف کچھ ذرا سے بھی اختیارات منتقل کر دیے جائیں، تو سلطنت کے جس حصے میں بھی ایسا کیا جائے گا وہاں کا انتظام خرابی سے کیسے بچ جائے گا۔ اس بات کو وہ سمجھنا چاہتے تھے۔

اس فقرے سے فرشتوں کا مدعا یہ نہ تھا کہ خلافت ہمیں دی جائے، ہم اس کے مستحق ہیں، بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ حضور کے فرامین کی تعمیل ہو رہی ہے، آپ کے احکام بجا لانے میں ہم پوری طرح سرگرم ہیں۔ مرضیٔ مبارک کے مطابق سارا جہان پاک صاف رکھا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ آپ کی حمد و ثنا اور آپ کی تسبیح و تقدیس بھی ہم خدام ادا کر رہے ہیں۔ اب کمی کس چیز کی ہے کہ اس کے لیے ایک خلیفہ کی ضرورت ہو؟ ہم اس کی مصلحت نہیں سمجھ سکتے (تسبیح کا لفظ ذومعنین ہے، اس کے معنی پاکی بیان کرنے کے بھی ہیں اور سرگرمی کے ساتھ کام اور انہماک کے ساتھ سعی کرنے کے بھی۔ اسی طرح تقدیس کے بھی دو معنی ہیں۔ ایک تقدس کا اظہار و بیان، دوسرے پاک کرنا)

قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

فرمایا: میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے

(البقرہ - آیت ۳۰)

یہ فرشتوں کے دوسرے شبہہ کا جواب ہے ۔ یعنی فرمایا: خلیفہ مقرر کرنے کی ضرورت و مصلحت میں جانتا ہوں، تم اسے نہیں سمجھ سکتے ۔ اپنی جن خدمات کا ذکر تم کر رہے ہو، وہ کافی نہیں ہیں ۔ بلکہ ان سے بڑھ کر کچھ مطلوب ہے ۔ اسی لیے زمین میں ایک ایسی مخلوق پیدا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے جس کی طرف کچھ اختیارات منتقل کیے جائیں۔ انسان کے علم کی صورت دراصل یہی ہے کہ وہ ناموں کے ذریعے سے اشیاء کو اپنے ذہن کی گرفت میں لاتا ہے، لہٰذا انسان کی تمام معلومات دراصل اسمائے اشیاء پر مشتمل ہیں ۔ آدم کو سارے نام سکھانا گویا ان کو تمام اشیاء کا علم دینا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرشتے اور فرشتوں کی ہر صنف کا علم صرف اسی شعبے تک محدود ہے جس سے اس کا تعلق ہے ۔ مثلاً ہوا کے انتظام سے جو فرشتے متعلق ہیں وہ ہوا کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر پانی کے متعلق کچھ نہیں جانتے ۔ یہی حال دوسرے شعبوں کے فرشتوں کا ہے ۔ انسان کو ان کے برعکس جامع علم دیا گیا ہے ۔ ایک ایک شعبے کے متعلق چاہے وہ اس شعبے کے فرشتوں سے کم جانتا ہو، مگر مجموعی حیثیت سے جو جامعیت انسان کے علم کو بخشی گئی ہے، وہ فرشتوں کو میسّر نہیں ہے ۔

یہ مظاہرہ فرشتوں کے پہلے شبہ کا جواب تھا ۔ گویا اس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے انھیں بتا دیا کہ میں آدم کو صرف اختیارات ہی نہیں دے رہا ہوں، بلکہ علم بھی دے رہا ہوں ۔ اس کے تقرر سے فساد کا جو اندیشہ تمہیں ہوا وہ اس معاملہ میں صرف ایک پہلو ہے ۔ دوسرا پہلو اصلاح کا بھی ہے اور وہ فساد کے پہلو سے زیادہ وزنی اور زیادہ بیش قیمت ہے ۔ حکیم کا کام یہ نہیں ہے کہ چھوٹی خرابی کی وجہ سے بڑی بہتری کو نظر انداز کر دے۔

حقیقتِ فرشتہ

ملک کے اصل معنی "پیامبر" کے ہیں ۔ اسی کا لفظی ترجمہ فرستادہ یا فرشتہ ہے ۔ یہ محض مجرد قوتیں نہیں ہیں جو تشخص نہ رکھتی ہوں بلکہ یہ شخصیت رکھنے والی ہستیاں ہیں ۔ جن سے اللہ اپنی اس عظیم الشان سلطنت کی تدبیر و انتظام میں کام لیتا ہے ۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ سلطنتِ الٰہی کے اہل کار ہیں ۔ جو اللہ کے احکام کو نافذ کرتے ہیں ۔ جاہل لوگ انھیں غلطی سے خدائی میں حصہ دار سمجھ بیٹھے اور بعض نے انھیں خدا کا رشتہ دار سمجھا اور ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش شروع کر دی ۔

فصل ۸

قیامِ جنّت اور اخراج

آدمؑ کو جنّت میں رکھنے کا مقصد

جنّت ممکن ہے آسمانوں میں ہو، اور ممکن ہے کہ اسی زمین پر بنائی گئی ہو۔ بہرحال وہاں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اس شان سے رکھا گیا تھا کہ اس کے کھانے پینے اور لباس و مکان کا سارا انتظام سرکار کے ذمہ تھا۔ اور خدمت گار (فرشتے) اس کے حکم کے تابع تھے۔ اس کو اپنی ذاتی ضروریات کے لیے قطعاً کوئی فکر نہ کرنی پڑتی تھی، تاکہ وہ خلافت کے بزرگ تر وظائف ادا کرنے کے لیے مستعد ہو سکے۔ مگر اس عہدے پر مستقل تقرر ہونے سے پہلے امتحان لینا ضروری سمجھا گیا، تاکہ امیدوار کی صلاحیتوں کا حال کھل جائے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کی کمزوریاں کیا ہیں۔ چنانچہ امتحان لیا گیا اور جو بات کھلی وہ یہ تھی کہ یہ امیدوار تحریص و اطماع کے اثر میں آکر پھسل جاتا ہے، اطاعت کے عزم پر مضبوطی سے قائم نہیں رہتا اور اس کے علم پر نسیان غالب آجاتا ہے۔

جنّت کا تصوّر

جنّت کی اس زندگی کو جو لوگ محض کھانے پینے اور اینڈنے کی زندگی سمجھتے ہیں، ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ وہاں پیہم ترقی ہوگی بغیر اس کے کہ اس کے لیے تنزل کا خطرہ ہو۔ اور وہاں خلافتِ الٰہی کے عظیم الشان کام انسان انجام دے گا، بغیر اس کے کہ اسے پھر کسی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔ مگر ان ترقیات اور خدمات کا تصوّر کرنا ہمارے لیے اتنا ہی مشکل ہے جتنا ایک بچّے کے لیے یہ تصوّر کرنا مشکل ہے کہ بڑا ہو کر جب وہ شادی کرے گا تو ازدواجی زندگی کی کیفیات کیا ہوں گی۔ اسی لیے قرآن مجید میں جنّت کی زندگی کے صرف انہی لذائذ کا ذکر کیا گیا ہے جن کا ہم اس دنیا کی لذّتوں پر قیاس کر کے کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

امتناعی حکم کے ذریعے آزمائش

زمین، یعنی اپنی جائے تقرر پر خلیفہ کی حیثیت سے بھیجے جانے سے پہلے آدمؑ وحوّا کو امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا تاکہ ان کے رجحانات کی آزمائش ہو جائے۔ اس آزمائش کے لیے ایک درخت کو چن لیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اس درخت کے قریب نہ پھٹکنا، اور اس کا انجام بھی بتا دیا گیا کہ ایسا کرو گے تو ہماری نگاہ میں ظالم قرار پاؤ گے۔ یہ بحث غیر ضروری ہے کہ وہ درخت کونسا تھا اور اس میں کیا خاص بات تھی کہ اس سے منع کیا گیا۔ منع کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس درخت کی خاصیت میں کوئی خرابی تھی اور اس سے آدم وحوّا کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ اصل غرض اس بات کی آزمائش تھی کہ یہ شیطان کی ترغیبات کے مقابلے میں کس حد تک حکم کی پیروی پر قائم رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے کسی ایک چیز کا منتخب کر لینا کافی تھا۔ اسی لیے اللہ نے درخت کا نام اور اس کی خاصیت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔

جنت میں اوّلین امتحان کے ذریعے تفہیم

اس امتحان کے لیے جنت ہی کا مقام سب سے زیادہ موزوں تھا۔ دراصل اسے [illegible] گاہ بنانے کا مقصود یہ حقیقت انسان کے ذہن نشین کرنا تھا کہ تمہارے لیے مرتبۂ انسانیت کے لحاظ سے جنت ہی لائق و مناسب مقام ہے۔ لیکن شیطانی ترغیبات کے مقابلے میں اگر تم اللہ کی فرمانبرداری کے راستہ سے منحرف ہو جاؤ گے، تو جس طرح ابتدا میں اس سے محروم کیے گئے تھے اسی طرح آخر میں محروم ہی رہو گے۔ اپنے اس مقامِ لائق کی، اپنی اس فردوس گم گشتہ کی بازیافت تم صرف اس طرح کر سکتے ہو کہ اپنے اس دشمن کا کامیابی سے مقابلہ کرو، جو تمہیں فرمانبرداری کے راستہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔

لغزش آدمؑ کی حقیقت

آدمؑ نے بعد میں اس حکم کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ اختیار قصدی اور ارادی سرکشی کی بنا پر نہ تھا، بلکہ غفلت اور بھول میں پڑ جانے اور عزم و ارادے کی کمزوری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے تھا۔ اس نے حکم کی خلاف ورزی کچھ اس خیال و نیت کے ساتھ نہیں کی تھی کہ میں خدا کی کیا پرواہ کرتا ہوں، اس کا حکم ہے تو ہوا کرے، جو کچھ میرا جی چاہے گا کروں گا۔ خدا کون ہوتا ہے جو میرے معاملات میں دخل دے؟ اس کے بجائے اس کی نافرمانی کا سبب یہ تھا کہ اس نے ہمارا حکم یاد رکھنے کی کوشش نہ کی، بھول گیا کہ ہم نے اسے کیا سمجھایا تھا اور اس کے ارادے میں اتنی مضبوطی نہ تھی کہ جب شیطان اسے بہکانے آیا اس وقت ہماری پیشگی تنبیہ اور نصیحت و فہمائش

کو (جس کا ذکر ابھی آگے آتا ہے) یاد کرتا اور اس کے دیے ہوئے لالچ کا سختی کے ساتھ مقابلہ کرتا۔ بعض لوگوں نے "اس میں عزم نہ پایا" کا مطلب یہ لیا ہے کہ ہم نے اس میں نافرمانی کا عزم نہ پایا۔ یعنی اس نے جو کچھ کیا بھولے سے کیا۔ لیکن یہ خواہ مخواہ کا تکلف ہے۔ یہ بات اگر کہنی ہوتی تو نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا عَلَى الْعِصْيَانِ کہا جاتا۔ نہ کہ محض لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ فقدانِ عزم سے مراد اطاعتِ حکم کے عزم کا فقدان ہے، نہ کہ نافرمانی کے عزم کا فقدان۔ علاوہ بریں اگر موقع و محل اور سیاق و سباق کی مناسبت سے دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اللہ آدمؑ کی پوزیشن صاف کرنے کے لیے یہ قصہ بیان نہیں کر رہا ہے، بلکہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ بشری کمزوری کیا تھی جس کا صدور ان سے ہوا، اور جس کی بدولت صرف وہی نہیں بلکہ ان کی اولاد بھی اللہ تعالیٰ کی پیشگی تنبیہات کے باوجود اپنے دشمن کے پھندے میں پھنسی اور پھنستی رہی ہے۔ مزید براں، جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر اس آیت کو پڑھے گا اس کے ذہن میں پہلا مفہوم یہی آئے گا کہ "ہم نے اس میں اطاعتِ امر کا عزم یا مضبوط ارادہ نہ پایا" دوسرا مفہوم اس کے ذہن میں اس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک وہ آدمؑ کی طرف معصیت کی نسبت کو نامناسب سمجھ کر آیت کے کسی اور معنی کی تلاش شروع نہ کر دے۔ یہی رائے علامہ آلوسیؒ نے بھی اس موقع پر اپنی تفسیر میں ظاہر فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

> "مگر تم سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ یہ تفسیر آیت کے الفاظ سن کر فوراً ذہن میں نہیں آتی اور نہ موقع محل کے ساتھ کچھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔"

یہاں اس بشری کمزوری کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے جو آدمؑ سے ظہور میں آئی۔ اللہ کو وہ اپنا خالق اور رب جانتے تھے اور دل سے مانتے تھے۔ جنت میں ان کو جو آسائشیں حاصل تھیں، ان کا تجربہ انھیں خود ہر وقت ہو رہا تھا۔ شیطان کے حسد و عداوت کا بھی ان کو براہِ راست علم ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دینے کے ساتھ ہی بتا دیا تھا کہ یہ تمھارا دشمن تمھیں نافرمانی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا، اور اس کا تمھیں یہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔ شیطان ان کے سامنے چیلنج دے چکا تھا کہ میں اسے بہکاؤں گا اور اس کی بیخ کنی کر کے چھوڑوں گا۔ ان ساری باتوں کے باوجود جب شیطان نے ان کو ناصحِ مشفق اور خیرخواہ دوست کے بھیس میں آ کر ایک بہتر حالت (زندگیٔ جاوداں اور سلطنت لازوال) کا لالچ دیا تو وہ اس کی تحریص کے مقابلے میں جم نہ سکے اور پھسل گئے۔ حالانکہ اب بھی خدا پر ان کے عقیدے میں فرق نہ آیا تھا، اور اس کے فرمان کے بارے میں ایسا کوئی خیال ان کے ذہن میں نہیں تھا کہ وہ سرے سے واجب الاذعان ہی نہیں ہے۔ بس ایک فوری

جذبے نے، جو شیطانی تحریص کے زیر اثر اُبھر آیا تھا، اُن پر ذہول طاری کر دیا، اور ضبطِ نفس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ طاعت کے مقامِ بلند سے معصیت کی پستی میں جا گرے۔ یہی وہ بھول اور فقدانِ عزم ہے جس کا ذکر قصے کے آغاز میں کیا گیا تھا اور اسی چیز کا نتیجہ وہ نافرمانی اور بھٹک ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ یہ انسان کی وہ کمزوری ہے جو ابتدائے آفرینش ہی میں اس سے ظاہر ہوئی اور بعد میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا ہے جبکہ یہ کمزوری اس میں نہ پائی گئی ہو۔

انسانی عظمت کا راز

شیطان یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ انسان اس فضیلت کا مستحق نہیں ہے جو اس کے مقابلہ میں انسان کو دی گئی ہے۔ پہلے ہی معرکے میں اس نے شکست کھائی۔ اس میں شک نہیں کہ اس معرکے میں انسان اپنے رب کے امر کی فرمانبرداری کرنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا اور اس کی یہ کمزوری ظاہر ہو گئی کہ وہ اپنے حریف کے فریب میں آ کر اطاعت کی راہ سے ہٹ سکتا ہے۔ مگر بہرحال اس اولین مقابلہ میں یہ قطعی ثابت ہو گیا کہ انسان اپنے اخلاقی مرتبہ میں ایک افضل مخلوق ہے۔ اولاً شیطان اپنی بڑائی کا خود مدعی تھا اور انسان نے اس کا دعویٰ آپ نہیں کیا، بلکہ بڑائی اسے دی گئی۔ ثانیاً شیطان نے خالص غرور و تکبر کی بنا پر اللہ کے امر کی نافرمانی آپ اپنے اختیار سے کی، اور انسان نے نافرمانی کو خود اختیار نہیں کیا، بلکہ شیطان کے بہکانے سے وہ اس میں مبتلا ہوا۔ اس نے شر کی کھلی دعوت کو قبول نہیں کیا، بلکہ داعئ شر کو داعئ خیر بن کر اس کے سامنے آنا پڑا۔ وہ پستی کی طرف پستی کی طلب میں نہیں گیا بلکہ اس دھوکے میں مبتلا ہو کر گیا کہ یہ راستہ اسے بلندی کی طرف لے جائے گا۔ ثالثاً شیطان کو تنبیہ کی گئی تو وہ اپنے قصور کا اعتراف کرنے اور بندگی کی طرف ہٹ آنے کی بجائے نافرمانی پر اور زیادہ جم گیا، اور جب انسان کو اس کے قصور پر تنبیہ کیا گیا تو اس نے شیطان کی طرح سرکشی نہیں کی۔ بلکہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ نادم ہوا اور اپنے قصور کا اعتراف کر کے بغاوت سے اطاعت کی طرف پلٹ آیا اور معافی مانگ کر اپنے رب کے دامنِ رحمت میں پناہ ڈھونڈنے لگا۔

خیر خواہی کے راستے سے شیطان کا حملہ

یہ بھی انسان کی عین فطرت ہے کہ وہ برائی کی کھلی دعوت کو کم ہی قبول کرتا ہے۔ عموماً اسے جال میں پھانسنے کے لیے ہر داعئ شر کو خیر خواہ کے بھیس میں آنا پڑتا ہے۔

انسان کے اندر معالی امور مثلاً بشریت سے بالاتر مقام پر پہنچنے یا حیاتِ جاودان حاصل کرنے کی ایک فطری پیاس موجود ہے اور شیطان کو اسے فریب دینے میں پہلی کامیابی اسی ذریعے سے ہوئی کہ اس نے انسان کی اس خواہش سے اپیل کیا۔ شیطان کا سب سے زیادہ چلتا ہوا حربہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو بلندی پر لے جانے اور موجودہ حالت سے بہتر حالت پر پہنچا دینے کی امید دلاتا ہے، اور پھر اس کے لیے وہ راستہ پیش کرتا ہے جو اُلٹا اسے پستی کی طرف لے جائے۔

حضرت حوّا کے متعلق غلط روایت

عام طور پر یہ جو مشہور ہو گیا ہے کہ شیطان نے پہلے حضرت حوّا کو دامِ فریب میں گرفتار کیا اور پھر انھیں حضرت آدمؑ کو پھانسنے کے لیے آلۂ کار بنایا، قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ شیطان نے دونوں کو دھوکا دیا اور وہ دونوں اس سے دھوکا کھا گئے۔ بظاہر یہ چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن جن لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت حوّا کے متعلق اس مشہور روایت نے دنیا میں عورت کے اخلاقی، قانونی اور معاشرتی مرتبے کو گرانے میں کتنا زبردست حصہ لیا ہے وہی قرآن کے اس بیان کی حقیقی قدر و قیمت سمجھ سکتے ہیں۔

جذبۂ شرم و حیا پر ضرب

اس قصے سے چند اہم حقیقتوں پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ انسان کے اندر شرم و حیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اور اس کا اوّلین مظہر وہ شرم ہے جو اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو دوسروں کے سامنے کھولنے میں آدمی کو فطرۃً محسوس ہوتی ہے۔ قرآن ہمیں بتایا ہے کہ یہ شرم انسان کے اندر تہذیب کے ارتقا سے مصنوعی طور پر پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ یہ اکتسابی چیز ہے، جیسا کہ شیطان کے بعض شاگردوں نے قیاس کیا ہے، بلکہ درحقیقت یہ وہ فطری چیز ہے جو اوّل روز سے انسان میں موجود تھی۔

(۲) شیطان کی پہلی چال جو اس نے انسان کو فطرتِ انسانی کی سیدھی راہ سے ہٹانے کے لیے چلی، یہ تھی کہ اس کے اس جذبۂ شرم و حیا پر ضرب لگائے، اور برہنگی کے راستے سے اس کے لیے فواحش کا دروازہ کھولے اور اس کو صنفی معاملات میں بدراہ کر دے۔ بالفاظِ دیگر اپنے حریف کے محاذ میں ضعیف ترین مقام جو اس نے حملے کے لیے تلاش کیا، وہ اس کی زندگی کا صنفی پہلو تھا۔ اور پہلی ضرب جو [illegible] سکائی وہ اس محاذ کی فصیل پر

ننگا کی۔ جو شرم وحیا کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں رکھی تھی۔ شیاطین اور ان کے شاگردوں کی یہ روش آج تک جُوں کی توں قائم ہے۔ "ترقی" کا کوئی کام ان کے ہاں شروع نہیں ہو سکتا جب تک عورت کو بے پردہ بازار میں نہ لا کھڑا کریں۔

قصۂ آدمؑ، مسئلہ لباس اور عربوں کے لیے ہدایت

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ
لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا
وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ
ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ
يَذَّكَّرُوْنَ ۝
يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ
كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ
يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا
سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ
هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا
تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ
اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝
(الاعراف۔ آیت ۲۶-۲۷)

"اے اولادِ آدم! ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمھارے جسم کے قابلِ شرم حصّوں کو ڈھانکے اور تمھارے لیے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو، اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں۔ اے بنی آدم! ایسا نہ ہو کہ شیطان تمھیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمھارے والدین کو جنّت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اتروا دیے تھے تاکہ ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے۔ وہ اور اس کے ساتھی تمھیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔ ان شیاطین کو ہم نے اُن لوگوں کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔"

یہاں قصۂ آدم و حوا کے ایک خاص پہلو کی طرف توجہ منعطف کر کے اہلِ عرب کے سامنے خود ان کی اپنی زندگی کے اندر شیطانی اغوا کے ایک نمایاں ترین اثر کی نشان دہی فرمائی جاتی ہے۔ یہ لوگ لباس کو صرف زینت اور موسمی اثرات سے جسم کی حفاظت کے لیے استعمال کرتے تھے، لیکن اس کی سب سے بنیادی غرض، یعنی جسم کے قابلِ شرم حصوں کی پردہ پوشی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ انھیں اپنے ستر دوسروں کے سامنے کھول دینے میں کوئی باک نہ تھا۔ برہنہ منظرِ عام پر نہا لینا، راہ چلتے قضائے حاجت کے لیے بیٹھ جانا، ازار کھل جائے تو ستر کے بے پردہ ہو جانے کی پروا نہ کرنا ان کے شب و روز کے معمولات تھے۔ اس سے

بھی بڑھ کر یہ کہ ان میں سے بکثرت لوگ حج کے موقع پر کعبہ کے گرد برہنہ طواف کرتے تھے اور اس معاملہ میں ان کی عورتیں ان کے مردوں سے بھی کچھ زیادہ بے حیا تھیں۔ ان کی نگاہ میں یہ ایک مذہبی فعل تھا اور نیک کام سمجھ کر وہ اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ پھر چونکہ یہ کوئی عربوں ہی کی خصوصیت نہ تھی، دنیا کی کثیر قومیں اسی بے حیائی میں مبتلا رہی ہیں اور آج تک ہیں اس لیے خطاب اہل عرب کے لیے خاص نہیں ——————

ہے بلکہ عام ہے، اور سارے بنی آدم کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ دیکھو، یہ شیطانی اغوا کی ایک کھلی ہوئی علامت تمہاری زندگی میں موجود ہے۔ تم نے اپنے رب کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر اور اس کے رسولوں کی دعوت سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دیا اور اس نے تمہیں انسانی فطرت کے راستے سے ہٹا کر اسی بے حیائی میں مبتلا کر دیا جس میں وہ تمہارے پہلے باپ اور ماں کو مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ اس پر غور کرو تو یہ حقیقت تم پر کھل جائے کہ رسولوں کی رہنمائی کے بغیر تم اپنی فطرت کے ابتدائی مطالبات تک کو نہ سمجھ سکتے ہو اور نہ پورا کر سکتے ہو۔

ان آیات میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے اس سے چند اہم حقیقتیں نکھر کر سامنے آجاتی ہیں۔

اوّل یہ کہ لباس انسان کے لیے ایک مصنوعی چیز نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کا ایک اہم مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم پر حیوانات کی طرح کوئی پوشش پیدائشی طور پر نہیں رکھی بلکہ حیا اور شرم کا مادہ اس کی فطرت میں ودیعت کر دیا۔ اس نے انسان کے لیے اس کے اعضائے صنفی کو محض اعضائے صنفی ہی نہیں بنایا بلکہ سَوْءَۃ بھی بنایا جس کے معنی عربی زبان میں ایسی چیز کے ہیں جس کے اظہار کو آدمی قبیح سمجھے۔ پھر اس فطری شرم کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے اس نے کوئی بنا بنایا لباس انسان کو نہیں دے دیا بلکہ اس کی فطرت پر لباس کا الہام کیا (قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا) تاکہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر اپنی فطرت کے اس مطالبے کو سمجھے اور پھر اللہ کے پیدا کردہ مواد سے کام لے کر اپنے لیے لباس فراہم کرے۔

دوم یہ کہ اس فطری الہام کی رو سے انسان کے لیے لباس کی اخلاقی ضرورت مقدم ہے، یعنی یہ کہ وہ اپنی سَوْءَۃ کو ڈھانکے۔ اور اس کی طبعی ضرورت مؤخر ہے، یعنی یہ کہ اس کا لباس اس کے لیے ریش (جسم کی آرائش اور موسمی اثرات سے بدن کی حفاظت کا ذریعہ) ہو۔ اس باب میں بھی فطرۃً انسان کا معاملہ حیوانات کے برعکس ہے۔ ان کے لیے پوشش کی اصل غرض صرف اس کا "ریش" ہونا ہے۔ رہا اس کا ستر پوش ہونا تو ان کے اعضائے صنفی سرے سے سَوْءَۃ ہی نہیں ہیں کہ انھیں چھپانے کے لیے حیوانات کی جبلت میں کوئی داعیہ موجود ہوتا۔

اور اس کا تقاضا پورا کرنے کے لیے ان کے اجسام پر کوئی لباس پیدا کیا جاتا۔ لیکن جب انسانوں نے شیطان کی رہنمائی قبول کی تو معاملہ پھر اُلٹ گیا۔ اس نے اپنے ان شاگردوں کو غلط فہمی میں ڈال دیا کہ تمہارے لیے لباس کی ضرورت بعینہٖ وہی ہے جو حیوانات کے لیے ریش کی ضرورت ہے، رہا اس کا سَوْآت کو چھپانے والی چیز ہونا تو یہ قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ جس طرح حیوانات کے اعضاء سَوْآت نہیں ہیں اسی طرح تمہارے یہ اعضاء بھی سَوْآت نہیں، محض اعضاءِ صنفی ہی ہیں۔

سوم یہ کہ انسان کے لیے لباس کا صرف ذریعۂ ستر پوشی اور وسیلۂ زینت و حفاظت ہونا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ فی الحقیقت اس معاملہ میں جس بھلائی تک انسان کو پہنچنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اس کا لباس تقویٰ کا لباس ہو، یعنی پوری طرح ساتر بھی ہو، زینت میں بھی حد سے بڑھا ہوا یا آدمی کی حیثیت سے گرا ہوا نہ ہو، فخر و غرور اور تکبر و ریا کی شان لیے ہوئے بھی نہ ہو، اور پھر اُن ذہنی امراض کی نمائندگی بھی نہ کرتا ہو جن کی بنا پر مرد زنانہ پن اختیار کرتے ہیں، عورتیں مردانہ پن کی نمائش کرنے لگتی ہیں، اور ایک قوم دوسری قوم کے مشابہ بننے کی کوشش کر کے خود اپنی ذلت کا زندہ اشتہار بن جاتی ہے۔ لباس کے معاملہ میں اس خیرِ مطلوب کو پہنچنا تو کسی طرح اُن لوگوں کے بس میں ہے ہی نہیں جنھوں نے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لا کر اپنے آپ کو بالکل خدا کی رہنمائی کے حوالے نہیں کر دیا ہے۔ جب وہ خدا کی رہنمائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں تو شیاطین ان کے سرپرست بنا دیے جاتے ہیں، پھر یہ شیاطین ان کو کسی نہ کسی غلطی میں مبتلا کر کے ہی چھوڑتے ہیں۔

چہارم یہ کہ لباس کا معاملہ بھی اللہ کی ان بے شمار نشانیوں میں سے ایک ہے جو دنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں اور حقیقت تک پہنچنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں۔ بشرطیکہ انسان خود ان سے سبق لینا چاہے۔ اوپر جن حقائق کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اگر انھیں تامل کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ لباس کس حیثیت سے اللہ تعالیٰ کا ایک اہم نشان ہے۔

ستر کھل جانا نافرمانی کا نتیجہ تھا

یہ گمان کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ شجرِ ممنوعہ کا مزا چکھتے ہی آدم و حوا کے ستر کا کھل جانا اس درخت کی کسی خاصیت کا نتیجہ تھا۔ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے سوا کسی اور چیز کا نتیجہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کا ستر اپنے انتظام سے ڈھانپا تھا۔ جب انھوں نے خلاف ورزی کی تو خدا کی حفاظت ان سے ہٹالی گئی، ان کا پردہ کھول دیا گیا اور انھیں خود ان کے نفس کے حوالے کر دیا گیا، کہ اپنی پردہ پوشی کا انتظام

خود کریں، اگر اس کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ اور اگر ضرورت نہ سمجھیں یا اس کے لیے سعی نہ کریں۔ تو خدا کو اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ وہ کس حال میں پھرتے ہیں۔ یہ گویا ہمیشہ کے لیے اس حقیقت کا مظاہرہ تھا کہ انسان جب خدا کی نافرمانی کرے گا تو دیر یا سویر اس کا پردہ کھُل کر رہے گا، اور یہ کہ انسان کے ساتھ خدا کی تائید و حمایت صرف اسی وقت تک رہے گی جب تک وہ خدا کا مطیعِ فرمان رہے گا۔ طاعت کے حدود سے قدم باہر نکالنے کے بعد اسے خدائی تائید ہرگز حاصل نہ رہے گی، بلکہ اسے خود اس کے نفس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہی وہ مضمون ہے جو متعدد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اور اسی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے۔ "خدایا! میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں۔ پس مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی میرے نفس کے حوالے نہ کر"۔

اس طرح شیطان کی راہ اور وہ راہ جو انسان کے لائق ہے، دونوں ایک دوسرے سے ممیز ہوگئیں۔ خالص شیطانی راہ یہ ہے کہ بندگی سے منہ موڑے اور خدا کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرے۔ متنبہ کیے جانے کے باوجود پورے استکبار کے ساتھ اپنے باغیانہ طرزِ عمل پر اصرار کیے چلا جائے۔ اور جو لوگ اطاعت کی راہ چل رہے ہوں، ان کو بھی بہکائے اور معصیت کی راہ پر لانے کی کوشش کرے۔ بخلاف اس کے جو راہ انسان کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ اوّل تو وہ شیطانی اغوا کی مزاحمت کرے، اور اپنے اس دشمن کی چالوں کو سمجھنے اور ان سے بچنے کے لیے ہر وقت چوکنا رہے، لیکن اگر کبھی اس کا قدم بندگی و اطاعت کی راہ سے ہٹ بھی جائے تو اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی ندامت و شرمساری کے ساتھ فوراً اپنے رب کی طرف پلٹے اور اس قصور کی تلافی کر دے جو اس سے سرزد ہو گیا ہے۔ یہی وہ اصل سبق ہے جو اللہ تعالیٰ اس قصے سے یہاں دینا چاہتا ہے۔

خطا معاف کرانے کی خواہش

آدم کو جب اپنے قصور کا احساس ہوا اور انھوں نے نافرمانی سے پھر فرمانبرداری کی طرف رجوع کرنا چاہا، اور ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے رب سے اپنی خطا معاف کرائیں تو انھیں وہ الفاظ نہ ملتے تھے جن کے ساتھ وہ خطا بخشی کے لیے دعا کر سکتے۔ اللہ نے ان کے حال پر رحم فرما کر وہ الفاظ بتا دیے۔[1]

توبہ آدم اور حقیقتِ ظلم

ظالم کا لفظ نہایت معنی خیز ہے۔ "ظلم" دراصل حق تلفی کو کہتے ہیں۔ ظالم وہ ہے جو کسی کا حق تلف

---

[1] رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (الاعراف ۔ ۲۳) (از مرتبین)

کرے۔ جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے۔ وہ درحقیقت تین بڑے بنیادی حقوق تلف کرتا ہے۔ اولاً خدا کا حق، کیونکہ وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی فرمانبرداری کی جائے۔ ثانیاً ان تمام چیزوں کے حقوق جن کو اس نے نافرمانی کے ارتکاب میں استعمال کیا۔ اس کے اعضائے جسمانی، اس کے قوائے نفس، اس کے ہم معاشرت انسان، وہ فرشتے جو اس کے ارادے کی تکمیل کا انتظام کرتے ہیں، اور وہ اشیاء جو اس کام میں استعمال ہوتی ہیں، ان سب کا اس پر یہ حق تھا کہ وہ صرف ان کے مالک ہی کی مرضی کے مطابق ان پر اپنے اختیارات استعمال کرے۔ مگر جب اس کی مرضی کے خلاف اس نے ان پر اختیارات استعمال کیے تو درحقیقت ان پر ظلم کیا۔ ثالثاً خود اپنا حق، کیونکہ اس پر اس کی ذات کا یہ حق ہے کہ وہ اُسے تباہی سے بچائے۔ مگر نافرمانی کر کے جب وہ اپنے آپ کو اللہ کی سزا کا مستحق بناتا ہے تو دراصل اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے۔ انہی وجوہ سے قرآن میں جگہ جگہ گناہ کے لیے ظلم اور گناہگار کے لیے ظالم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

گمراہ کن نظریۂ گناہ کی تردید

قرآن اس نظریے کی تردید کرتا ہے کہ گناہ کے نتائج لازمی ہیں اور وہ بہرحال انسان کو بھگتنے ہی ہوں گے۔ یہ انسان کے اپنے خود ساختہ گمراہ کن نظریات میں سے ایک بڑا نظریہ ہے، کیونکہ جو شخص ایک مرتبہ گناہگار زندگی میں مبتلا ہو گیا، اس کو یہ نظریہ ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیتا ہے اور اگر اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کے بعد وہ سابق کی تلافی اور آئندہ کے لیے اصلاح کرنا چاہے تو یہ اس سے کہتا ہے کہ تیرے بچنے کی اب کوئی امید نہیں۔ جو کچھ تو کر چکا ہے، اس کے نتائج بہرحال تیری جان کے لاگو ہی رہیں گے۔ قرآن اس کے برعکس یہ کہتا ہے کہ بھلائی کی جزا اور برائی کی سزا دینا بالکل اللہ کے اختیار میں ہے۔ تمہیں جس بھلائی پر انعام ملتا ہے وہ تمہاری بھلائی کا طبعی نتیجہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا فضل ہے، چاہے عنایت فرمائے، چاہے نہ فرمائے۔ اسی طرح جس برائی پر تمہیں سزا ملتی ہے، وہ بھی برائی کا طبعی نتیجہ نہیں ہے کہ لازماً مترتب ہو کر ہی رہے، بلکہ اللہ تعالیٰ پورا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے معاف کر دے اور چاہے سزا دے دے۔ البتہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت، اس کی حکمت کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔ وہ چونکہ حکیم ہے اس لیے اپنے اختیارات کو اندھا دھند استعمال نہیں کرتا۔ جب کسی بھلائی پر انعام دیتا ہے تو یہ دیکھ کر ایسا کرتا ہے کہ بندے نے سچی نیت کے ساتھ اس کی رضا کے لیے بھلائی کی تھی، اور جس بھلائی کو رد کر دیتا ہے، اسے اس بنا پر رد کرتا ہے کہ اس کی ظاہری شکل بھلے کام کی سی تھی مگر اپنے اندر اپنے رب کی رضا جوئی کا خالص جذبہ نہ تھا۔ اسی طرح وہ سزا اس قصور پر دیتا ہے جو باغیانہ

جسارت کے ساتھ کیا جائے اور جس کے پیچھے شرمساری کے بجائے مزید ارتکاب جرم کی خواہش موجود ہو، اور اپنی جہالت سے معافی اس قصور پر دیتا ہے، جس کے بعد بندہ اپنے کیے پر شرمندہ اور آئندہ کے لیے اپنی اصلاح پر آمادہ ہو۔ بڑے سے بڑے مجرم، کٹے سے کٹے کافر کے لیے بھی خدا کے ہاں مایوسی و ناامیدی کا کوئی موقع نہیں، بشرطیکہ وہ اپنی غلطی کا معترف، اپنی نافرمانی پر نادم اور بغاوت کی روش چھوڑ کر اطاعت کی روش اختیار کرنے کے لیے تیار ہو۔

حضرت آدمؑ گناہ سے پاک کر دیے گئے

اطاعت کی کوشش میں ناکام ہو کر جہاں گر گئے تھے وہاں انھیں پڑا نہیں چھوڑ دیا گیا، بلکہ اٹھا کر پھر اپنے پاس بلا لیا۔ اور اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ ایک سلوک وہ ہے جو بالارادہ بغاوت کرنے والے اور اکڑ اور ہیکڑی دکھانے والے نوکر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا مستحق شیطان تھا، اور ہر وہ بندہ ہے جو ڈٹ کر اپنے رب کی نافرمانی کرے اور خم ٹھونک کر اس کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ دوسرا سلوک وہ ہے جو اس وفادار بندے کے ساتھ کیا جاتا ہے جو محض "بھول" اور "فقدانِ عزم" کی وجہ سے قصور کر گزرا۔ اور پھر ہوش میں آتے ہی اپنے کیے پر شرمندہ ہو جائے۔ یہ سلوک حضرت آدم و حوا سے کیا گیا کیونکہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ پکار اٹھے تھے۔

> "اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور اگر تو ہم سے درگزر نہ فرمائے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔"

صرف معاف ہی نہیں کیا بلکہ آئندہ کے لیے راہ راست بھی بتائی اور اس پر چلنے کا طریقہ بھی سکھایا۔ آدمؑ نے توبہ کی اور اللہ نے قبول کر لی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدمؑ اپنی نافرمانی پر عذاب کے مستحق نہ رہے۔ گناہگاری کا جو داغ ان کے دامن پر لگ گیا تھا وہ دھو ڈالا گیا۔ نہ یہ داغ ان کے دامن پر رہا، نہ ان کی نسل کے دامن پر اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی کہ معاذاللہ! خدا کو اپنا اکلوتا بھیج کر نوعِ انسانی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سولی پر چڑھوانا پڑتا۔ برعکس اس کے اللہ نے آدم علیہ السلام کی توبہ ہی قبول کرنے پر اکتفا نہ فرمایا بلکہ اس کے بعد انھیں نبوت سے بھی سرفراز کیا تاکہ وہ اپنی نسل کو سیدھا راستہ بتا کر جائیں۔

زمین پر اتارا جانا بطور سزا نہیں تھا

اب جو جنت سے نکلنے کا حکم پھر دہرایا گیا، تو اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قبولِ توبہ کا یہ مقتضیٰ نہ تھا

کہ آدم کو جنت ہی میں رہنے دیا جاتا اور زمین پر نہ اتارا جاتا۔ زمین ان کے لیے دارالعذاب نہ تھی، وہ یہاں سزا کے طور پر نہیں آ رہے گئے، بلکہ انھیں زمین کی خلافت ہی کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ جنت ان کی اصل جائے قیام نہ تھی، وہاں سے نکلنے کا حکم ان کے لیے سزا کی حیثیت نہ رکھتا تھا، اصل تجویز تو ان کو زمین ہی پر اتارنے کی تھی، البتہ اس سے پہلے ان کو امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ حضرت آدم و حوا کو جنت سے اُتر جانے کا یہ حکم سزا کے طور پر دیا گیا تھا۔ قرآن میں متعدد مقامات پر اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور انھیں معاف کر دیا تھا۔ لہٰذا اس حکم میں سزا کا کوئی پہلو نہیں ہے، بلکہ یہ اس منشا کی تکمیل ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا تھا۔

زمین میں آزمائشی خلافت

آدمؑ اور ان کی اولاد کو مستقل خلافت پر مامور کرنے کے بجائے آزمائشی خلافت عطا کی گئی، اور آزمائش کے لیے ایک مدت (اجل مسمّٰی جس کا اختتام قیامت پر ہوگا) مقرر کر دی گئی۔ اس آزمائش کے دور میں ہمیں اللہ کے لیے معیشت کا سرکاری انتظام ختم کر دیا گیا۔ اب اپنی معاش کا انتظام انھیں خود کرنا ہے۔ البتہ زمین اور اس کی مخلوقات پر ان کے اختیارات برقرار ہیں۔ آزمائش اس بات کی ہے کہ اختیار رکھنے کے باوجود یہ اطاعت کرتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر "بھول" لاحق ہوتی ہے، یا تحریص و اطماع کے اثر میں آ کر پھسلتے ہیں تو تنبیہ و تذکیر اور تعلیم کا اثر قبول کر کے سنبھلتے بھی ہیں یا نہیں؟ اور ان کا آخری فیصلہ کیا ہوتا ہے، طاعت کا یا معصیت کا؟ اس آزمائشی خلافت کے دوران میں ہر ایک کے طرزِ عمل کا ریکارڈ محفوظ رہے گا۔ اور یوم الحساب میں جو لوگ کامیاب نکلیں گے انھی کو پھر مستقل خلافت، اس دائمی زندگی اور لازوال سلطنت کے ساتھ جس کا لالچ دے کر شیطان نے حکم کی خلاف ورزی کرائی تھی، عطا کی جائے گی۔ اس وقت یہ پوری زمین جنت بنا دی جائے گی اور اس کے وارث خدا کے صالح بندے ہوں گے جنھوں نے آزمائشی خلافت میں طاعت پر قائم رہ کر، یا "بھول" لاحق ہونے کے بعد بالآخر طاعت کی طرف ہٹ کر اپنی اہلیت ثابت کر دی ہوگی۔

نسلِ انسانی کے لیے خدا کا مستقل فرمان

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ	"پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے،
تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا	تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے

هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا
وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝
(البقرہ - آیات ۳۸-۳۹)

کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔ اور جو اس کو
قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات
کو جھٹلائیں گے، وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں،
جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

یہ نسل انسانی کے حق میں ابتدائے آفرینش سے قیامت تک کے لیے اللہ کا مستقل فرمان ہے اور اسی کو تیسرے رکوع میں اللہ کے "عہد" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسان کا کام خود راستہ تجویز کرنا نہیں بلکہ بندہ اور خلیفہ ہونے کی دوگونہ حیثیتوں کے لحاظ سے وہ اس پر مامور ہے کہ اس راستہ کی پیروی کرے، جو اس کا رب اس کے لیے تجویز کرے اور اس راستے کے معلوم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو کسی انسان کے پاس براہِ راست اللہ کی طرف سے وحی آئے، یا پھر وہ اس انسان کا اتباع کرے، جس کے پاس وحی آئی ہو۔ کوئی تیسری صورت یہ معلوم کرنے کی نہیں ہے کہ رب کی رضا کس راہ میں ہے۔ ان دو صورتوں کے ماسوا ہر صورت غلط ہے بلکہ غلط ہی نہیں، سراسر بغاوت بھی ہے جس کی سزا جہنم کے سوا کچھ اور نہیں۔

دنیا میں تنگ زندگی کا مطلب

سورۂ طٰہٰ کی آیات ۱۱۷ تا ۱۱۹ میں تشریح ہے اس مصیبت کی جس میں جنت سے نکلنے کے بعد انسانوں کو مبتلا ہو جانا تھا۔ اس موقع پر جنت کی بڑی اور اکمل و افضل نعمتوں کا ذکر کرنے کے بجائے اس کی چار بنیادی نعمتوں کا ذکر کیا گیا۔ یعنی یہ کہ یہاں تمھارے لیے غذا، پانی، لباس، اور مسکن کا انتظام سرکاری طور پر کیا جا رہا ہے۔ تم کو ان میں سے کوئی چیز بھی حاصل کرنے کے محنت اور کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ اس سے خود بخود یہ بات آدم و حوا پر واضح ہوگئی کہ اگر وہ شیطان کے بہکاوے میں آکر حکم سرکار کی خلاف ورزی کریں گے، تو جنت سے نکل کر انھیں یہاں کی بڑی نعمتیں تو درکنار، یہ بنیادی آسائشیں تک حاصل نہ رہیں گی۔ وہ اپنی بالکل ابتدائی ضروریات کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے اور اپنی جان کھپانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ چوٹی سے ایڑی تک پسینہ جب تک نہ بہائیں گے ایک وقت کی روٹی تک نہ پا سکیں گے۔ معاش کی فکر ہی ان کی توجہ اور ان کے اوقات اور ان کی قوتوں کا اتنا بڑا حصہ کھینچ لے جائے گی کہ کسی بلند تر مقصد کے لیے کچھ کرنے کی نہ فرصت رہے گی، نہ طاقت۔

دنیا میں تنگ زندگی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے تنگ دستی لاحق ہوگی۔ بلکہ اس کا مطلب

یہ ہے کہ یہاں اسے چین نصیب نہ ہوگا۔ کروڑ پتی بھی ہوگا تو بے چین رہے گا۔ ہفت اقلیم کا فرمانروا بھی ہوگا تو بے کلی و بے اطمینانی سے نجات نہ پائے گا۔ اس کی دنیاوی کامیابیاں ہزاروں قسم کی ناجائز تدبیروں کا نتیجہ ہوں گی جن کی وجہ سے اپنے ضمیر سے لے کر گردوپیش کے پورے اجتماعی ماحول تک ہر چیز کے ساتھ اس کی پیہم کشمکش جاری رہے گی جو اسے کبھی امن و اطمینان و مسرت سے بہرہ مند نہ ہونے دے گی۔

اوّلین سبق اور اس کی یاددہانی

۱۔ وہ بھولا ہوا سبق جسے قرآن یاد دلا رہا ہے، وہی سبق ہے جو نوعِ انسانی کو اس کی پیدائش کے آغاز میں دیا گیا تھا۔ جسے یاد دلاتے رہنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا اور جسے یاد دلانے کے لیے قرآن سے پہلے بھی بار بار "ذکر" آتے رہے۔

۲۔ انسان اس سبق کو بار بار شیطان کے بہکانے سے بھولتا ہے۔ اور یہ کمزوری وہ آغازِ آفرینش سے برابر دکھا رہا ہے۔ سب سے پہلی بھول اس کے اوّلین ماں باپ کو لاحق ہوئی تھی اور اس کے بعد سے اس کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اسی لیے انسان اس کا محتاج ہے کہ اس کو پیہم یاددہانی کرائی جاتی رہے۔

۳۔ یہ بات کہ انسان کی سعادت و شقاوت کا انحصار بالکل اس برتاؤ پر ہے جو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے اس "ذکر" کے ساتھ وہ کرے گا، آغازِ آفرینش ہی میں یہ بات صاف صاف بتا دی گئی تھی۔ آج یہ کوئی نئی بات نہیں کہی جا رہی کہ اس کی پیروی کرو گے تو گمراہی و بدبختی سے محفوظ رہو گے، ورنہ دنیا و آخرت دونوں میں مبتلائے مصیبت ہو گے۔

۴۔ ایک چیز ہے بھول اور عزم کی کمی اور ارادے کی کمزوری جس کی وجہ سے انسان اپنے ازلی دشمن شیطان کے بہکانے میں آجائے اور غلطی کر بیٹھے۔ اس کی معافی ہو سکتی ہے بشرطیکہ انسان غلطی کا احساس ہوتے ہی اپنے رویے کی اصلاح کر لے، اور انحراف کی راہ چھوڑ کر اطاعت کی طرف پلٹ آئے۔ دوسری چیز وہ سرکشی اور سرتابی اور خوب سوچ سمجھ کر اللہ کے مقابلے میں شیطان کی بندگی ہے جس کا ارتکاب فرعون اور سامری نے کیا۔ اس چیز کے لیے معافی کا کوئی امکان نہیں۔ اس کا انجام وہی ہے جو فرعون اور سامری نے دیکھا۔ اور یہی انجام ہر وہ شخص دیکھے گا جو اس روش پر چلے گا۔ (باقی)

محدثِ قرطبہ بقی بن مخلد رحمۃ اللہ علیہ

جناب طیب شاہین صاحب

(۲)

اعتقادی نظریات امام بقی بن مخلدؒ کے اعتقادی نظریات بھی وہی تھے جو دیگر فقہائے حدیث کے تھے۔ مشرق کے برعکس اگرچہ اندلس میں ان دنوں اعتقادی مناقشات بہت کم تھے۔ تاہم بلادِ مشرق میں قیام کے دوران انہوں نے دوسرے اعتقادی فرقوں کی آراء کا ضرور مطالعہ کیا ہوگا اور انہیں معلوم ہوگیا ہوگا کہ جبریہ، قدریہ، جہمیہ، مرجیہ، معتزلہ اور مشبہ وغیرہ کی آراء کے جھاڑ جھنکار میں صرف اہلِ سنت اور سلفِ صحابہ و تابعین کی راہ جو سراسر "تفویض" کی راہ ہے مامون و مصئون ہے۔ اس لیے وہ جمہور فقہاء و محدثین کے جادۂ اعتقاد پر گامزن رہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے ساتھ ان کا خصوصی تعلق ان کے اسی مسلکِ اعتقاد پر دلالت کرتا ہے۔

امام بقی بن مخلد رحمۃ اللہ علیہ کے فقہی نظریات کے سلسلے میں ہم ایک بات کا تذکرہ بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ پروفیسر ابوزہرہ مرحوم کی رائے ہے کہ اندلس میں ظاہری مذہب امام بقی بن مخلد کے ذریعے داخل ہوا۔ انہوں نے بغیر کسی دلیل کے اپنی اس رائے کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی ہے کہ چونکہ امام داؤد ظاہری رحمۃ اللہ علیہ اور امام بقی بن مخلدؒ دونوں ہم عصر تھے۔ اس لیے امام بقیؒ کو امام داؤدؒ سے تلمذ کا تعلق رہا ہوگا، لہٰذا وہ فقہ ظاہری کو اندلس میں منتقل کرنے کا باعث بنے۔ ہم بھی یہ رائے رکھتے ہیں کہ امام بقی بن مخلدؒ نے اندلس میں وہ تمام بنیادی مواد فراہم کر دیا تھا جس کے بغیر فقہ ظاہری کی عمارت تعمیر نہیں ہو سکتی اور وہ ہے نصوص کی فراوانی۔ لیکن ہمارا

خیال ہے کہ بقی بن مخلد کو امام داؤد ظاہری سے تلمذ کا رشتہ ہرگز نہیں رہا۔ اس کے لیے ہمارے پاس مندرجہ ذیل دلائل ہیں:

اولاً:۔ ہماری معلومات کی حد تک جناب امام بقی بن مخلدؒ کے کسی سوانح نگار نے بقی بن مخلد اور امام داؤد ظاہری کے اس تعلق کا تذکرہ نہیں کیا۔ حالانکہ یہ تعلق ایک ایسا امر ہے جس کا تذکرہ بہت ضروری تھا۔

ثانیاً:۔ جناب داؤد ظاہریؒ امام بقی بن مخلدؒ سے عمر میں قدرے چھوٹے ہی تھے۔ امام بقیؒ کے طلب علم کے زمانے میں داؤد ظاہری بھی طالب علم ہوں گے۔ نیز یہ ممکن نہیں کہ امام بقی بڑے بڑے جلیل القدر اساتذہ کو چھوڑ کر امام داؤد ظاہری جیسے نوعمر عالم کی طرف متوجہ ہوئے ہوں اور وہ بھی ان حالات میں جب کہ اکثر اصحاب الحدیث جناب داؤد ظاہری سے اجتناب کرتے تھے۔

ثالثاً:۔ امام داؤد ظاہریؒ کے متعلق علامہ ابوبکر خطیب بغدادیؒ "تاریخ بغداد" میں رقمطراز ہیں۔ "فی کتبہ حدیث کثیر الا ان الروایة عنہ عزیزة جداً"

"امام داؤد ظاہری کی کتابوں میں اگرچہ حدیث بہت زیادہ تھی مگر بہت ہی کم لوگوں نے اُن سے حدیث روایت کی ہے"[1]۔

اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ امام داؤد ظاہری خلقِ قرآن کے عقیدے کے حامل تھے اور یہی وہ عقیدہ ہے جس کی وجہ سے مامون، معتصم اور واثق کے عہد میں اصحابِ حدیث پر مظالم کے پہاڑ توڑے گئے اور خاص طور پر امام اہلِ سنت جناب احمد بن حنبلؒ کو مبتلائے آزمائش کیا گیا۔

تذکرۃ الحفاظ میں علامہ ذہبیؒ رقمطراز ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ نے داؤد ظاہری سے محض اس وجہ سے ملاقات تک گوارا نہ کی کہ وہ خلق قرآن کا عقیدہ رکھتے تھے[2] اور اس عقیدے کی وجہ سے امام احمدؒ اُن کو بدعتی سمجھتے تھے[3]۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام داؤد بن علی ظاہری رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] تاریخ بغداد علامہ خطیب بغدادیؒ طبع بیروت جلد ۸ ص ۳۷۰

[2] تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی جلد ۲ ص ۵۷۲۔ تاریخ بغداد جلد ۸ ص ۳۷۴

[3] تاریخ بغداد جلد ۸ ص ۳۷۳

دین و ورع اور علم و تقویٰ کے بہت بلند مقام پر فائز تھے مگر اس کا کیا کیجیے کہ فقہاء و محدثین ان سے بدکتے تھے۔ بہت سے علماء اُن کو کافر تک کہنے سے گریز نہ کرتے تھے[1] اصبہان سے بغداد منتقل ہوئے تو اصبہان سے علماء نے کہلا بھیجا کہ داؤد "خلقِ قرآن کے قائل ہیں"[2]۔ امام بقی بن مخلد جو اپنے عالی مقام استاد کے رنگ میں رنگے گئے تھے کس طرح یہ برداشت کر سکتے تھے کہ وہ کسی ایسے شخص کے سامنے زانوئے ادب تہہ کریں جو ایسے عقیدے کا حامل تھا جس کی وجہ سے علمائے اہلِ سنّت و حدیث مصائب و ابتلاء سے دوچار ہوئے۔

رابع:- ہمارے خیال میں امام بقی بن مخلدؒ کے پاس علمِ حدیث امام داؤد ظاہریؒ سے زیادہ تھا اس میدان میں امام بقی کے طبقے میں بہت کم علماء ایسے ہیں جن کے متعلق بقیؒ کے ہم پلہ ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام بقی بن مخلدؒ نے اندلس میں ظاہریت کے لیے زمین ہموار کی، مگر اس کی وجہ نہ تو یہ ہے کہ امام بقی قیاس کا انکار کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بقیؒ داؤد ظاہری کے شاگرد رہ چکے تھے اور اُن سے متاثر تھے۔ ہماری نظر میں اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ امام بقیؒ حریت فکر اور فقہ اثری کے نقیب تھے اور احکام کے استنباط کو کسی خاص فقہی دائرے میں محدود کرنے کے قائل نہ تھے۔ وہ فقہ کو انہی مآخذ سے اخذ کرتے تھے جہاں سے سلف نے اخذ کی تھی اور انہوں نے اندلس میں اسی مسلک کی آبیاری کی۔ یہ حریتِ فکر ایک ایسی خصوصیت ہے جو فقہِ حدیث و اثر اور فقہ ظاہری میں مشترک ہے۔

اندلس میں فقہ اثری کی ترویج اور فقہاء کی مخالفت

امام بقی بن مخلدؒ جب وطن واپس لوٹے تو اُن کے پاس مصنف ابن ابی شیبہ کا نسخہ تھا۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا ایک ضخیم مجموعہ اور صحابہؓ، فقہائے تابعین اور دیگر علماء کے فتاویٰ کا بڑا ذخیرہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اندلس میں ایک جدید فقہ کی تخم ریزی کی اور وہ تھی فقہ اثری۔ گویا بقی بن مخلدؒ

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۸ ص ۳۷۴

[2] تاریخ بغداد جلد ۸ ص ۳۷۳، ۳۷۴

فقہ اثری کی ترویج کے لیے بلادِ مشرق سے مکمل مواد ساتھ لائے تھے۔ اہل اندلس کے لیے یہ ایک بالکل نئی اور انوکھی چیز تھی۔ جو احادیث امام بقی بن مخلدؒ بیان کرتے تھے ان میں سے اکثر ایسی تھیں جو اہل اندلس کے لیے بالکل نئی تھیں۔ تابعین اور دیگر فقہا کے فتاویٰ جو بقیؒ اپنے ساتھ لائے تھے۔ اندلس کے وہ علماء ان سے ناواقف تھے جو اب تک صرف امام مالک اور فقہائے مدینہ کے اقوال پر فتویٰ دیتے رہے تھے۔ اس لیے جب امام بقی بن مخلدؒ نے قرطبہ میں حدیث کی تدریس و تعلیم شروع کی اور دیگر علماء کی فقہی آراء بیان کیں تو قرطبہ کے علماء اُن کی مخالفت پر اُتر آئے۔

استقرارِ مذاہب سے پہلے لوگ اپنے اپنے شہر کے اہلِ علم کے فتویٰ پر عمل کر لیا کرتے تھے۔ دیگر بلادِ اسلام کی طرح اندلس میں بھی یہی طریقہ رائج تھا۔ پھر رفتہ رفتہ امامِ شام جناب عبدالرحمٰن بن عمرو اوزاعی کے فقہی نظریات نے اثر و نفوذ کیا۔ دوسری صدی ہجری کے اواخر تک اندلسی اہلِ علم امام اوزاعی سے متاثر رہے۔ آخر ہشام بن عبدالرحمٰن کے زمانے میں زیاد بن عبدالرحمٰن اندلسی، سبطون بن عبداللہ اندلسیؒ، حفص بن عبدالسلام اندلسیؒ، فرعوس بن عباس اندلسیؒ، حسان بن عبدالسلام اندلسی، حبیب بن ابی حبیبؒ، المغازی بن قیس اندلسیؒ، سعید بن الحکم اندلسیؒ، سعید بن ابی ہند اندلسیؒ، سعید بن عبدوس اندلسیؒ، عباس بن ناصحؒ اندلسی، عبدالرحمٰن بن عبداللہ اشبونی اندلسیؒ اور دیگر بے شمار علماء کے توسط سے مؤطا امام مالک اور فقہ مالک اندلس میں داخل ہوئی۔[۱] پھر علم کے بے شمار شیدا انہوں نے امام دارالہجرت سے جا کر علم حاصل کیا۔ اور دوسری صدی کے اختتام تک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی شہرت، اُن کی مقبولیت اور اُن کے فقہی نظریات اندلس میں پھیل گئے۔ پھر ابو عبداللہ زیاد بن عبدالرحمٰن المعروف بہ شبطون (المتوفی ۱۹۳ھ) یحییٰ بن یحییٰ (المتوفی ۲۳۴ھ)، عبدالملک بن حبیب (المتوفی ۲۳۸ھ) اور محمد بن احمد بن عبدالعزیز قرطبی (المتوفی ۲۵۵ھ) کے ذریعہ فقہ امام مالکؒ کو اندلس میں استقرار ہوا۔ اموی امراء نے اندلس میں فقہ امام مالک کی سرپرستی کی اور فقہ مالک کے حاملین کو قضا کے عہدوں پر فائز کیا۔ یحییٰ بن یحییٰ

[۱] تنویر الحوالک شرح مؤطا امام مالک۔ علامہ سیوطیؒ طبع مصر جلد ۱ ص ۱۱

محدث قرطبہ ـــ امام بقی بن مخلدؒ جب حصولِ علم کی خاطر بلادِ مشرق میں آئے تو اس وقت مدونین حدیث تدوین کے مراحل طے کر چکی تھی۔ محدثین نے تمام بلادِ اسلام کی احادیث کے طرق کی جانچ پڑتال کے بعد ان کو منقح کر کے صحیح اور متفق علیہ احادیث کو ضعیف اور ناقابلِ عمل احادیث سے علیحدہ کر کے جمع کر لیا تھا۔ اصولی طور پر اب کسی شہر کے کسی عالم کے لیے کوئی عذر نہ تھا کہ وہ اپنے خود ساختہ اور غیر متفق علیہ اصولوں کے مقابلے میں احادیثِ صحیحہ کو رد کرے۔ امام بقی بن مخلدؒ جو اندلس میں اب تک موطا اور امام مالک کی فقہی آرا کا مطالعہ کر کے آئے تھے۔ اندلس میں ہو سکتا ہے کہ انہوں نے علامہ عبدالمالک بن حبیبؒ کی "الواضحۃ" اور علامہ محمد بن احمد بن عبدالعزیز کی آراء کا بھی مطالعہ کیا ہو۔ انہوں نے اب تک یہی دیکھا تھا کہ علماء اور عوام امام مالکؒ کے ساتھ بے حد عقیدت رکھتے ہیں۔ علماء اُن کے اقوال پر مسائل کی تخریج کرتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے امام شافعیؒ کی طرح اندلس یا بلادِ مشرق میں شدید غلو کے یہ مظاہر سے بھی دیکھے ہوں گے کہ لوگ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی ٹوپی کے طفیل بارش کی دعا کرتے ہیں[1]۔ اس قسم کے غلو سے ان کا دل ضرور کڑھتا ہوگا۔ جب انہوں نے بلادِ مشرق میں مختلف علماء سے حدیث کی سماعت کی ہوگی کہ جب اُن پر غور و تدبر کیا ہوگا تو انہیں یہ حقیقت معلوم ہو گئی ہوگی کہ حق صرف ایک شہر کے علماء کے اقوال میں محصور نہیں ہے۔ اور نہ سنتِ نبوی صرف کسی ایک شہر کی مروی احادیث سے اخذ کی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ کسی ایک شہر میں محصور ہو کر نہ رہ گئے تھے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت نے امام بقی بن مخلد کے نظریات کی اس منہاج کو بالکل نکھار دیا تھا۔ جب وہ قرطبہ آئے تو علماء کے ساتھ جو امام مالکؒ کے اقوال سے باہر نہ نکلتے تھے علمی مناقشات و مجادلات کا شروع ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ ان علماء کے تقلیدی اور جامد ذہن کا یہ حال تھا کہ بقول شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ یحییٰ بن یحییٰ سوائے چار مسئلوں کے باقی تمام مسائل میں کامل طور پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال کی اتباع کرتے

(باقی برصفحہ ۴۶)

[1] "ابن حزم" پروفیسر ابوزہرہ مرحوم۔ اردو ترجمہ ص ۶۸

منیر رپورٹ سے منیر رپورٹ تک

جناب نعیم صدیقی صاحب

(۲)

ایک اور کلمۂ مدح

منیر رپورٹ کے ایک اور مداح کا کلمۂ ستائش بڑا دلچسپ ہے۔ جسٹس منیر نے اپنے نشہ نرگسیت میں اسے بھی جوں کا توں نقل کر دیا ہے وہ کوئی صحافی ہے جس نے جسٹس رپورٹ کی تحسین یوں کی ہے کہ آج تک دو ہی کتابیں میرے مطالعہ میں ایسی آئیں جنہیں شروع سے آخر تک پڑھے بغیر چھوڑنا گوارانہ ہوا۔ پہلی تھی "لیڈی چیٹرلے کا عاشق" (Lady Chatterley's Lover)، اور دوسری منیر رپورٹ (ص ۴۳) داد دیجیے صحافی کی مہارت بیان کو کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس نے دونوں کتابوں کو مساویانہ اہمیت دے کر مدح کی ہے یا ذم۔ اسی لیے جسٹس صاحب بھی کہہ اٹھے کہ "کیا ہی تقابل ہے؟" (What a comparison) اس شخص نے رپورٹ کی تعریف صرف اس لحاظ سے کی ہے کہ وہ اتنی دلچسپ تھی کہ تسلسل توڑے بغیر اسے پڑھا۔ یہ تعریف لیڈی چیٹرلے والے ناول[1] ہی کی نہیں۔ کسی جاسوسی کہانی، کسی کوک شاستر، کسی کتاب لطائف

---

[1] "لیڈی چیٹرلے" میں اس کے "عاشق" کے جنسی کرتوتوں کو نکال دیا جائے تو پھر اسے کون خریدے اور پڑھے۔ ہمارے ہاں محبت ایک پاک صاف باطنی جذبے کا نام ہے مگر انگریزی میں جو چیز Love کہلاتی ہے اس کا زیادہ تر مفہوم جسموں کی حرکات پر ہوتا ہے یعنی وہاں کے سیکولر حیوان ناطق کا عاشق "نطق" سے آغاز کرتا ہے؛ "نقل" (کھانے پینے) کو ذریعہ قرب بناتا ہے۔ تھوڑی سی نقل و حرکت (اکٹھے ویک اینڈ گذارنے کے لیے کسی ساحلی مقام کا رخ کرنا) سے گرماگرمی پیدا کرتا ہے پھر زیادہ دیر نہیں گذرتی کہ حیوانیت کا پورا ڈراما اوپن اسٹیج پر (بقیہ حاشیہ صفحۂ آئندہ)

کی بھی کی جاسکتی ہے ہو سکتا ہے کہ صحافی مذکور کے لیے اصل سامان دلچسپی یہی ہو کہ عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر احوال و معاملات کی گردنیں کس طرح مروڑی جاسکتی ہیں اور معزز ترین شائستہ بیان لوگوں کے بیانوں کے فصد جرح کے نشتروں سے کیسے کھولے جاسکتے ہیں دوسروں کے طرز فکر اور ان کے مدعا کو خود انہی کے منہ پر بدلنا اور بات کو کچھ کا کچھ بنا کر دکھانا ایک ایسی کارروائی ہے جس کی دلچسپی میں تو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ وہی ایک صحافی نہیں اس ملک کے ہزاروں ذی شعور افراد کے ساتھ راقم الحروف بھی جج کے ان پہلوؤں کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا ہے۔

منیر رپورٹ کے مداح صحافی کو رپورٹ اس لیے مذکورہ ناول کے مساوی درجے پر پسند آئی کہ یہ کہانی سیکولرازم کے ایک سچے محب (Lover) کی ہے۔ ساری رپورٹ ایک ڈراما ہے مختلف کردار آتے ہیں، ڈائیلاگ بولتے ہیں کچھ پارٹ ادا کرتے ہیں اور اوجھل ہو جاتے ہیں صرف ہدایت کار چیف ایکٹر بن کر شروع سے آخر تک ہر سین میں موجود رہتا ہے۔ دوسرے ہر کردار کے کندھے پہ ہدایت کار صاحب یا تو خود سوار ہو جاتے ہیں یا سوار ہونے کی بار بار کوشش کرتے ہوئے گرتے ہیں اور غصے میں آجاتے ہیں۔ سوار ہو جائیں تو جس سے جو مکالمہ چاہیں کرالیں۔

پس ہم بھی دل کھول کر داد دیتے ہیں کہ یہ رپورٹ ایک متوسط صحت مند ڈرامے سے بھی زیادہ دلچسپ ہے

جسٹس صاحب اپنے مداحوں کا تذکرہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

جماعت اسلامی کا تبصرہ

"پھر اس رپورٹ پر کوئی تنقید نہیں کی گئی سوائے اس کے جو جماعت اسلامی کی طرف سے ہوئی"۔ (ص ۳۴)

(بقیہ حاشیہ) پیش کر دیتا ہے راستہ چلتے ہوئے یا پارکوں اور سیرگاہوں میں ہر جگہ یہ سیکولر Lover ہوتی ملے گی لیڈی چیٹرلے وہ ناول ہے جو تا دیر ممنوع الاشاعت رہا مگر اب چھپتا ہے کیونکہ معاشرہ فحاشی کے میدان میں اس سے دس قدم آگے جاچکا ہے۔ لیڈی چیٹرلے کے عاشق پہ Love کے دورے بکثرت پڑتے ہیں۔ کبھی بستر پہ، کبھی جنگل کی جھاڑیوں میں، کبھی غسل خانے میں اور ناول نگار تمام مواقع کی تصاویر کھینچتا جاتا ہے یہ عظمت ہے سیکولرسٹ معاشرے کی۔ اسلام میں یہ خوش فعلیاں کہاں؟ اسی لیے تو جسٹس منیر نے اسلام سے ناراض ہو کے یہ رپورٹ لکھی۔

مگر جماعت اسلامی (بحالاتِ موجودہ کالعدم) کی اس تنقید کو بے وزن قرار دینے کے لیے جسٹس صاحب نے لکھا ہے کہ:۔

"وہ (جماعت) جسے ہم نے اضطرابات کی ذمہ داری میں حصہ دار قرار دیا ہے:" (ص ۴۳) تاثر یہ پیدا کرنا مطلوب ہے کہ جماعت کا تبصرہ تو ناراضگی کی وجہ سے تھا کیونکہ ہم نے خرابیٔ احوال کی ذمہ داری (جزوی طور پر) اس پر ڈالی ہے۔

ہم آگے چل کر اس تبصرہ کے چند اہم نکات کو پیش کریں گے تاکہ ایک بار پھر حقائق کو اس طرح تازہ کر دیا جائے جسے منیر صاحب نے رپورٹ کے اندر رو معارف کا خلاصہ از سرِ نو شائع فرما دیا ہے کوئی بھی انصاف پسند آدمی جماعت کے تبصرے کے ان نکات کو ——— یا ضرورت ہو تو پورے تبصرے کو ——— خود مطالعہ کر کے دیکھ سکتا ہے کہ منیر رپورٹ کے متعلق جو تنقیدی بحث کی گئی ہے وہ کہاں تک درست ہے اور اس کی روشنی میں منیر رپورٹ کی صحیح قدر و قیمت کیا قرار پاتی ہے؟[۵]

۵؎ منیر صاحب بھی اپنے اس ترجیحی مقام کو جانتے ہیں اور ہم بھی اعتراف کرتے ہیں کہ وہ سرکاری عدالتی منصب کی وجہ سے سرکار کی تیار کردہ ہوئی رپورٹ کو تمام دوسری حکومتوں اور سیاسی، علمی اور تحقیقی اداروں تک پہنچا سکتے ہیں بلکہ خود حکومت نے اسے پہلے ہی پہنچا دیا ہے۔ منیر صاحب تو اب جو کتاب بھی لکھیں گے۔ یورپ امریکہ اور برطانیہ میں اسے ضرور توجہ سے پڑھا جائے گا خصوصاً اسلام دشمن مستشرقین اور مخالف علماء سیکولرسٹ اسکی بڑھ چڑھ کر قدر کریں گے اور منیر صاحب کے بہم کردہ مواد کو اسلامی تحریکات کے خلاف استعمال کریں گے منیر صاحب کی رپورٹ کو اگر گھر کے لوگوں نے جوم کے سینے سے نہیں لگایا ہے تو باہر کے لوگ اسکے ایک ایک لفظ کو موتیوں میں تولیں گے منیر صاحب نے علماء کے حوالے سے اسلام کو ایسی شکل دے کر اغیار کے سامنے رکھا ہے کہ جہاں کہیں اسلامی سپرٹ کے ساتھ مسلمان تجدید حیات کیلئے اٹھیں گے اغیار کی پروپیگنڈہ مشینری منیر صاحب کے فراہم کردہ مواد کو مؤثر طور سے کام میں لائیگی۔ عدالتی سٹیج پر کھڑے ہو کر اسلام کو ناپسند کرنے والی دنیا کے سامنے منیر صاحب نے اسلام کا ایک ایسا مسخ شدہ چہرہ پیش کیا ہے کہ جسے دیکھ کر خوف و دہشت پھیل جائے کیسی اعلیٰ تبلیغ اسلام ہے اور کیسی نادر خدمت پاکستان! اس پہلو سے جب رپورٹ پر نظر جاتی ہے تو ان لوگوں کی بات میں کشش معلوم ہوتی ہے کہ منیر رپورٹ کو ضبط قرار دینا چاہیے مگر اب اگر ایسا ہو بھی تو بعد از وقت ہو گا جس کا فائدہ سوائے اسکے کچھ نہیں کہ رپورٹ کی طرف دنیا کی توجہات بطور خاص مبذول ہو جائیں۔

میں اس امر پر حیرت زدہ ہوں کہ جسٹس منیر صاحب نے اپنے مداحین کے خیالات تو اس کتاب میں پیش کر دیے ہیں وہ اگر انصاف پسند ہوتے تو رپورٹ کے متعلق جو واحد تبصرہ ان کے سامنے آیا تھا اس کا بھی خلاصہ خود بیان کرتے اور جو سوالات اس میں اٹھائے گئے ہیں ان کا جواب دیتے جسٹس صاحب سے اتنا بھی تو نہیں ہو سکا کہ اس واحد تبصرے کے بارے میں دو چار تاثراتی سطریں ہی لکھ دیتے میں سمجھتا ہوں کہ جسٹس صاحب کا موقف اتنا کمزور ہے اور ان کے تحقیقاتی کام میں اتنے ٹیڑھ ہیں کہ وہ یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ کسی ایسے شخص یا جماعت کی بات پر توجہ دیں جو ان کی کمزوریوں کو نمایاں کرے۔

جسٹس صاحب کی ایک خصوصی کمزوری بذریعہ تحقیقاتی عدالت یہ واضح ہوتی ہے کہ وہ اپنی بات منوانے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں مگر دوسروں سے نہ کوئی استفادہ کرتے ہیں نہ کسی دوسرے کی کسی دلیل سے اثر لیتے ہیں نہ دوسروں کے بہتر نقطہ نظر کا اعتراف کرتے ہیں اور نہ کوئی بات قبول کرتے ہیں چنانچہ ۱۹۵۳ء سے لے کر اب تک جو عرصہ گذرا ہے اس میں کیا کیا کچھ ہوا اور کیا کچھ منیر صاحب کے سامنے آیا مگر حرام ہے جو رتی بھر بھی کوئی تبدیلی انہوں نے اپنی ۲۷ سال پہلے کی آرا میں قبول کی ہو۔ ایسی ضدی اور متحجر شخصیتیں قوموں کی بہبود کا ذریعہ نہیں بن سکتیں۔

منیر صاحب کیلئے لمحہ مسرت

زیر مطالعہ کتاب کے ابتدائی اوراق میں جب منیر صاحب کا یہ ارشاد میری نظر سے گذرا کہ اسلام مغربی اور مشرقی پاکستان کو وابستہ رکھنے میں بہت ہی کمزور رشتہ ثابت ہوا (ص ۱۰) تو مجھے منیر صاحب کی مسرت پنہاں پر بہت صدمہ ہوا۔

قضیہ اگر یوں ہو کہ کسی شخص کو چار آدمی پکڑ کر اس کا بازو کاٹ ڈالیں تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ بدن کی وحدت کو قائم رکھنے والی فطرت بہت کمزور نکلی؟ لمبی سازشوں کے بعد سابق مشرقی پاکستان کی بھارت نواز آبادی کو تیار کر کے نیز روسی دوستی اور اسلحہ اور اسرائیلی مہارت جنگ سے استفادہ کر کے اگر مشرقی پاکستان کو الگ کر لیا گیا تھا تو اس میں اسلام کا کیا قصور تھا، وسطی ملیشیا، قازقستان اور روسی ترکستان کی ریاستوں کے مسلمان اگر چالیس برس تک روسی تسلط کے خلاف لڑتے لڑتے دم توڑ گئے تو اس سانحہ کی ذمہ داری اسلام کی کسی کمزوری پر کس طرح آتی ہے؟ مغربی امپریلزم کی یلغار کے خلاف عرب، افریقی اور ایشیائی ممالک نے جو شاندار مزاحمت دکھائی اس کا ایک بڑا محرک اسلام تھا اب اگر جغرافی اور مادی وجوہ سے اور مسلمانوں کی اپنی بعض نادانیوں یا کمزوریوں کے باعث ہمارے اکثر و بیشتر ملک مغربی تسلط میں

چلے گئے تو اس میں اسلام کی کس کوتاہی کا دخل تھا؟ اسلام نے تو شروع کی ہر مزاحمت میں بھی بڑا حصہ لیا ہے اور بعد میں غلامی کے خلاف اٹھنے والی مسلم تحریکات میں بھی اس کا غیر معمولی اثر دیکھا جا سکتا ہے بلکہ یہ اسلام ہی ہے جو مغرب کے فکری تسلط کے خلاف پون صدی سے مسلمانوں کو احیائے اسلام کے محاذ پر جمع کر کے معرکے لڑا رہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیکولرازم کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ اور سیکولرسٹ حضرات یا تو مہر بلب ہو کر تہہ خانوں میں جا بیٹھے ہیں یا ان میں اگر کوئی شخص منیر صاحب کی طرح اپنے نظریات کو نمایاں کرتا ہے تو وہ اس قوم میں تنہا رہ جاتا ہے۔ اس کے نظریات دلوں اور دماغوں میں جڑ نہیں پکڑتے۔

پھر منیر صاحب کو سوچنا یہ بھی تو چاہیے تھا کہ پاکستان کا مغربی حصہ ہو یا مشرقی اس میں معاشرہ اسلامی اساس پر عملاً پوری طرح تعمیر نہیں ہو چکا تھا بلکہ ایک قوم اس خواہش کے ساتھ اٹھی تھی کہ یہ سارا نظام حیات اسلامی اصولوں پر استوار کرنا ہے۔ اور اسی ارادے کی وجہ سے عالمی طاقتیں اور مختلف ممالک و اقوام پاکستان کے اس ارادے کو ایک "خطرہ" سمجھتی تھیں اور اس کے لیے ایڈ اور ماہرین اور معاہدوں اور بین الاقوامی اداروں کے ذریعے پاکستان کو گھیر گھار کر سیکولرازم کی راہ کی طرف ڈالنا چاہتی تھیں۔ نیز اسی غرض سے وہ اپنے اندر کے سیکولرسٹوں کو دستور سازی کے ابتدائی مراحل سے لے کر تا ایندم پاکستان کی گاڑی کا رخ موڑنے کے لیے استعمال کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ اس منصوبے میں پوری طرح کامیابی نہ ہونے پر انہوں نے اسے کمزور کرنے کی سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ مشہور کتاب "پاکستان کٹ ٹو اٹس سائز" کے عنوان ہی کا مفہوم یہ ہے کہ پاکستان کا دماغ درست کر دیا گیا ہے۔

منیر صاحب اور ان کے ہم خیال اس حقیقت پر بھی غور فرمائیں کہ جو علیحدگی لڑائی جھگڑے اور خون خرابی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس کو دونوں خطوں کے عوام اور ان کی حکومتوں نے فراموش کر کے از سر نو تعلقاتِ اخوت استوار کرنا شروع کر دیے ہیں۔ کیا یہ اسلام ہی نہیں جس کا اثر بار بار تاریخ میں نمودار ہوتا ہے؟ اس کوشش میں بھی ہزار طرح کی رخنہ اندازیاں ہو سکتی ہیں کیونکہ مسلم حکومتیں معاندت اور انتقام کی جذبات رکھنے والی طاقتوں میں گھری ہوئی ہیں۔

آخر میں جسٹس منیر اور ان کے ہم خیالوں سے گذارش ہے کہ وہ موجودہ دنیا کے نقشے کو دیکھیں جس میں برپا ہونے والی ہر نزاع و کشمکش بالعموم دینی یا نظریاتی بنیادیں رکھتی ہیں۔ سوشلسٹ حکومتوں

اور تحریکوں کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ غیر سوشلسٹ قوتوں کے خلاف محاذ آرا ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے بھی قبرص اور ارٹیریا اور فلسطین اور جنوبی فلپائن میں دینی بنیادوں پر معرکہ آرائی ہو رہی ہے۔ عیسائی دنیا سے آپ مثال چاہیں تو برطانیہ میں آئرلینڈیوں کی جدوجہد پیش کی جا سکتی ہے۔

اس گفتگو کی تکمیل کرتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ سیکولر متحدہ وطنی قومیتیں تو قطعی طور پر ناکام ہو چکی ہیں۔ جہاں کہیں اس قسم کی کوئی مصنوعی قوم موجود ہے۔ وہاں ایک مصیبت برپا ہے۔ دور نہ جائیں، بھارت کے سیکولر نظام میں مسلمانوں کو جن تباہ کن بلوؤں کا سامنا وقفے وقفے پر ہو رہا ہے، آسام اور تھائی لینڈ کے مسلمانوں پر مسلمان ہونے کی وجہ سے جو آزمائش آئی ہوئی ہے اور کمبوچیا اور ویت نام میں مسلمانوں کو جس طرح تباہ کیا گیا ہے، ان سارے حالات کا جائزہ لے کر بھی اگر کوئی شخص دین کو اجتماعی دائرے سے الگ رہ کر سیکولرازم کے خیالی گھوڑے دوڑاتا ہے تو ایسے آدمی کی خوش فہمیوں پر رحم کھانا چاہیے۔

جسٹس صاحب! سیکولرازم کا فلسفہ ایجاد ہو کر تجربوں سے گزرا اور اب ناکامی سے دوچار ہے۔ پھر آخر یہ کیا مصیبت ہے کہ آپ نہ صرف یہ کہ خود اس کا جھنڈا اٹھائے کھڑے ہیں بلکہ دوسروں سے بھی چاہتے ہیں کہ وہ اس کو سلامی دیں۔ اب تو وقت آگیا ہے کہ ہر ملک میں سیکولرازم کا مزار بنایا جائے اور اس کے لیے کسی بہترین سیکولرسٹ کو مجاور بنا کر اس پر بٹھایا جائے۔

پاکستان کے مشرقی حصے کی علیحدگی سے اگر اسلام کے خلاف آپ کے سیکولرازم کا کیس مضبوط ہوتا ہو تو پھر یہ بتائیے کہ خود سیکولرازم کیوں سیکولرازم سے ٹکراتا ہے؟

محترم جسٹس صاحب! تاریخ بڑی پیچیدہ چیز ہے۔

پاکستان میں سیکولر نظریہ کی کمر ٹوٹ چکی ہے

ایران اور افغانستان کے احوال کا تجزیہ، اور ساں کی توجیہہ تو رہی الگ، خود پاکستان کی دستور سازی کے دائرے میں سیکولرازم کی پے درپے شکستیں عبرت آموز ہیں۔ اور منیر صاحب کی تازہ کتاب کا بھی مرکزی کیس یہ ہے کہ قائداعظم ۱۱ اگست ۴۷ء والی تقریر کے مقتضیات کے مطابق ایک ماڈرن سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے، مگر بعد کے لوگوں نے[۱] (مراد ہیں

---

[۱] اول تو قائداعظم کی ۱۱ اگست والی تقریر کو ان کے تمام دوسرے ارشادات سے ٹکرا دینا جو پاکستان بننے سے

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

خان لیاقت علی خان اور سردار نشتر سے لے کر ایوب، بھٹو تک سبھی لوگ اسفینے کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا۔ اس دعوے کا تجزیہ تو بھی شاید آگے جاکر کرنا پڑے۔ البتہ اس سے متعلق دو ایک اہم تاریخی مواقع کا تذکرہ آئے گا۔

کسی بھی سیکولرسٹ کے لیے پہلا امید افزا موقع صدر ایوب کا دورِ حکومت تھا۔

منیر صاحب کہتے ہیں کہ صدر ایوب بڑے وسیع المشرب آدمی تھے۔ جبھی تو ماڈرن اسلام اور بیسک ڈیموکریسی کے علمبردار تھے۔ جج صاحب اس فوجی حکمران کی تعریف میں کہتے ہیں کہ اس نے صرف ایک بار اسلام پر تقریر کی تھی (ص ۸۱) یہ الگ بات ہے کہ تھوڑے بہت ریمارکس اسلام کے بارے میں وہ موقع بہ موقع دے لیتے۔ یہی سیکولر آدمی کی پسند کی بات ہے کہ مسلمانوں کا حکمران جو شخص ہو، وہ اسلام

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) پہلے اور بعد میں سامنے آئے، بہت بڑی زیادتی ہے۔ ایسی زیادتی اگر کوئی جج کرے تو پھر اس زیادتی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر ممکن ہوا تو ہم قائد اعظم کے ارشادات کا باقاعدہ تجزیہ کر کے دکھائیں گے کہ انہوں نے کیا چاہا اور کیا کیا؟ بعدہٗ یہ سوال دریافت طلب ہے کہ آیا قائد اعظم اپنے خیالات میں فرد واحد تھے؟ نہ خان لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر اور دوسرے لیڈر اُن سے متفق تھے، نہ بہ حیثیت مجموعی مسلم لیگ یہ جانتی تھی کہ انہوں نے کیا نازک بات کہی ہے یا جانتی تھی تو مانتی نہ تھی؟ اس سے بھی آگے گذر کر تحریک پاکستان کو چلانے اور اُس کے لیے قربانیاں دینے والے عوام کو بھی ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ان کا ذہن کس طرح تیار کیا جا رہا تھا۔ اور ۱۱ اگست والی تقریر کے بعد کیا وہ قائد اعظم کا ساتھ چھوڑ کر کیا ایک اُلٹے راستے پر چل نکلے۔ ان ساری صورتوں سے آسان اور ہلکا فیصلہ یہ ہو سکتا ہے کہ منیر صاحب نے شخص واحد کی حیثیت سے ۱۱ اگست کی تقریر کا جو مفہوم سمجھا وہ غلط تھا۔ اگر اُسے غلط نہ مانا جائے تو پھر تمام مسلم لیگ، اس کے تمام لیڈروں، تمام علماء اور تمام عوام کو غلط ماننا ہوگا۔ اور یہ دعویٰ کرنا ہوگا کہ قائد اعظم اپنے نقطہ نظر میں فرد تنہا تھے یا زیادہ سے زیادہ جسٹس منیر ان کے ساتھ تھے۔ باقی ساری قوم دوسرے طرزِ فکر کی تھی۔ اگر ایسا تھا تو جمہوری لحاظ سے بات تو وہی چل سکتی تھی جس کی قائل ساری قوم تھی۔ براہ کرم جسٹس منیر صاحب اپنا ریکارڈ درست کریں۔

کو بہت زیادہ موضوع سخن نہ بنائے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے سیکولرازم کو نقصان پہنچتا ہے[1]۔

اچھا تو آیئے اصل قصے کی طرف! جسٹس صاحب فرماتے ہیں کہ مئی ۱۹۶۲ء کے پہلے ہفتے میں ایوب صاحب نے ایک دستور نافذ کیا جس میں نہ تو بنیادی حقوق تھے اور نہ "اسلام کا نام"۔ یعنی ریاست کے نام سے اس لفظ کو ساقط کر دیا گیا۔ ان قرآن اور سنت کے اصولوں کا تذکرہ تھا، اور اسلامی طرز زندگی (ISLAMIC WAY OF LIFE) کا حوالہ بھی تھا۔

کام یوں چلتا رہتا تو منیر صاحب کی مرادیں بر آتیں۔ مگر ہوا یہ کہ سابق دستور ساز اسمبلی کے رہے سہے عناصر مسلسل زور دے رہے تھے کہ ۱۹۵۶ء کے دستور کے اسلامی خدوخال لازماً شامل کیے جانے چاہئیں ایوب اس مطالبے کو رد کرنے پر قادر نہ تھا۔ سو وہ چیزیں شامل ہوئیں۔ (ص ۸۳)

پھر کہتے ہیں:

"بعدازاں جب میں ایوبی کابینہ کا ممبر تھا اور پولیٹیکل پارٹیز بل ایک اجلاس میں زیر بحث تھا، ایک شخص نے بل میں ترمیم کرنے کی تحریک کی۔ ترمیم یہ تھی کہ کوئی ایسی پارٹی نہ بنائی جائے، جس کا نصب العین نظریۂ پاکستان کے خلاف پڑتا ہو" (ص۔ ۲۵) اس پر چوہدری فضل الٰہی (سابق صدر پاکستان) سیٹ سے اٹھے اور انہوں نے نظریۂ پاکستان پر اعتراض کیا کہ اس کی وضاحت ہونی چاہیے۔ اس پر جس ممبر نے ترمیم کی تحریک اٹھائی تھی، یہ کہا کہ نظریہ پاکستان، اسلام ہے۔ لیکن (منیر صاحب کہتے ہیں) کسی شخص نے یہ سوال نہیں اٹھایا کہ اسلام کیا ہے؟ تجویز میں ترمیم پاس ہوگئی"

ہمارا سوال یہ ہے کہ اور کسی کو اگر اسلام کے معنی کسی ڈکشنری میں دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور نہ وضاحت طلب کرنے کی تو ایک منیر صاحب ہی کے دماغ میں کون سے خاص خلیات ایسے لگ گئے تھے جو اسلام اور اس کی ہر چیز کو پہچاننے میں حائل تھے۔ اگر ایسا تھا بھی تو اسلام کے معنی کے متعلق کسی دوسرے کے سوال اٹھانے کے بجائے جج صاحب نے بہ حیثیت رکن کابینہ خود کیوں نہ استفہام فرمایا؟ اور یہی وہ کمزوری ہے جسٹس منیر کی کہ وہ عدالت کی کرسی پر تو شیر ہیں، لیکن کسی مجلس میں بیٹھے ہوں تو خاموش

---

[1] یہاں ایک دلچسپ جملہ سامنے آتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام تو آیا تھا بت پرستی سے نجات دلانے کے لیے مگر مسلمانوں نے خود اسلام ہی کو ایک بت بنا لیا۔ کل دوسرا سیکولرسٹ یہ شگوفہ چھوڑے گا کہ مسلمانوں نے تو خدا ہی کو (نعوذ باللہ) بت بنا لیا ہے۔

دیکھیے مزید فرماتے ہیں کہ:

"جہاں اسلام کا نام آجائے تو پھر کوئی شخص اس کے خلاف کوئی بات نہیں کہے گا" (ص ۲۶)

کسی دوسرے کا کچھ نہ کہنا تو خیر کمزوری شمار ہوگا لیکن آپ جیسا بصیرت مند آدمی بھی کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکے تو ہزار افسوس۔ میرا خیال ہے کہ اس موقع پر بھی ایک تحقیقاتی عدالت یہ سلسلہ کارروائی کابینہ لگانی چاہیے تھی۔ اس کی صدارت آپ کرتے تو جس چیز کے چاہتے پرخچے اڑا دیتے۔

پھر فرماتے ہیں کہ ایوب صاحب کراچی میں تھے۔ واپس آئے تو میں نے اس معاملے پہ سوال کیا کہ یہ کیوں ہوا ہے؟ جواب ملا کہ:

"اس سارے معاملے میں دنیا کیا کہے گی؟"

"یہ دنیا کیا کہے گی" کے الفاظ عمومی معنوں کے علاوہ ایک خصوصی مفہوم بھی رکھتے ہیں۔ یعنی ان میں جمہوریت بھی بول رہی ہے۔ ایوب صاحب کا مدعا یہ تھا کہ جب چاروں طرف لوگ ایک خاص نقطہ نظر کے ہوں، کابینہ تک میں بھی وہ موجود ہوں تو میں تن تنہا اگر کوئی ردّ و بدل کروں گا تو یہ الزام میری ذات پر آئے گا کہ آمرانہ قوتوں سے کام لے کر میں اسلام کا راستہ روکنا چاہتا ہوں۔

پھر آگے جو بھٹو صاحب کے دور کا جسٹس منیر نے ذکر کیا ہے کہ منکرات و فواحش کی بندش ہوئی، اسلامی قوانین کا اعلان ہوا۔ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تو یہی رائے عام کا جمہوری دباؤ تھا جس نے اپنا اثر دکھایا۔

پھر یہاں انتخابات ۱۹۷۷ء کے خلاف تحریک قومی اتحاد اٹھی جس نے ایک بار پھر مسلم عوام کو اس طرح متحرک کر دیا جس طرح وہ تحریک پاکستان یا جہاد ستمبر کے لیے متحرک ہوئے تھے اس عوامی تحریک میں اتنا زور پیدا ہوا کہ بالآخر ایک دورِ حکومت ختم ہو گیا اور فوج بیچ میں آئی مگر فوج بھی پاکستان کی اسلامی اساسیات کو ختم کرنے کی بجائے ان اساسیات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نہایت ہی مشکل ملکی اور خارجہ حالات میں از سر نو جوش لیکر اٹھی رہا یہ سوال کہ کامیابی و ناکامی کے لحاظ سے اس کا کیا مقام ہے تو یہ ایک الگ بحث چاہتا ہے۔

اب تو صرف ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے کہ جسٹس منیر خود سیکولرازم کے علمبردار بن کر اٹھیں اور ایک نئی پارٹی اٹھائیں جو اسلام کے اثرات سے دستور اور سیاست کو خالی کر دے۔

سب بے ہمت؟ (باقی)

مطبوعات

قادیانی امت
مؤلف: محمد شفیع جوش میرپوری
صفحات: ۱۲۸ - قیمت ۳/- روپے
ناشر: مجلسِ اخوتِ اسلامیہ - پاکستان
جامع مسجد - الیف بلاک - ماڈل ٹاؤن - لاہور

محمد شفیع جوش صاحب نوجوان ہیں، کام کرنے کا جوش رکھتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں فتنۂ قادیانیت کی نئی ہل چل تھی۔ جوش صاحب نے اسے گردن سے دبوچنے کا ارادہ کیا اور یہ مختصر سی کتاب لکھی۔ اس میں بہت سی ایسی حقیقتیں جمع ہو گئی ہیں جن کے پڑھنے سے ایک عام آدمی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کیا تھے، انہوں نے دین کے لیے کیا کیا ستم ایجاد کیے۔ اور پھر اُن کی امت نے اسلام اور مسلمانوں سے کیا سلوک کیا۔ دین میں تحریفات اور تلبیسات کی سخت تکلیف دہ مثالیں سامنے آتی ہیں۔ حیرت ہے اُن لوگوں پر جو مسلمانوں کے گھر پیدا ہونے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ایسا کمزور دماغ رکھتے ہیں کہ اس میں کوئی بھی مار و کژدم گھس سکتا ہے اور کوئی بھی بوم و خفاش آشیانہ بنا سکتا ہے۔ اب یہ کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے۔

قادیان سے اسرائیل تک
مؤلف: مولینا سمیع الحق - ایڈیٹر "الحق"
ناشر: مؤتمر المصنفین - اکوڑہ خٹک پشاور
قیمت: مجلد، صفحات ۲۰۴ عدد - ۱۵/- روپے

مولینا سمیع الحق کو ہر پڑھا لکھا شخص جانتا ہے کہ فتنوں کے مقابلے میں اُن کا قلم برہنہ تلوار ہے، اور وہ باطل کے بظاہر خوبصورت چہرے کا غازہ الگ کر کے اصل کریہہ منظر دکھا دیتے ہیں۔

"قادیانیت" بھی مولینا کا ایک خاص موضوع رہی ہے۔ اس بصیرت افروز کتاب کو پڑھے بغیر یہ نہیں جانا جا سکتا کہ مولینا کیوں اس گروہ کو مارِ آستین ٹولہ کہتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سلسلہ قادیانیت محض مذہبی یا صوفیانہ نوعیت کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مزاج صیہونیت

جیسا ہے یہ اپنا خاص کام خفیہ طریقوں سے کرتی ہے۔ اہلِ مغرب اور اسرائیل کے ساتھ اس کا قاررورہ خاص طور ہمیشہ مل رہا ہے۔ روس میں اس گروہ نے جاسوسی کی ہے۔ پھر عالمِ اسلام میں نہایت نازک مراحل میں انہوں نے ریشہ دوانیاں کی ہیں۔ افغانستان، شام، ترکی، انڈونیشیا اور افریقہ کے مسلم ممالک میں یہ لوگ کارِ خاص کرتے رہے ہیں۔ حبشہ میں اُن کے ڈاکٹر جاسوسی پہ مامور رہے۔ اُن کے اکابر کے بعض سفر اور خفیہ ملاقاتیں، ان کے تہ دار بیانات اور اعلانات اور اُن کی موجودہ حالات کے متعلق پیش گوئیاں پھر ربوہ میں قادیانی حکمرانی کا تجربہ، اختلاف یا سرتابی کرنے والوں کو بدنی و مالی سزاؤں کے علاوہ سوشل مقاطعہ سے لے کر قتل تک کی کارروائیاں۔

خود پاکستان میں یہ گروہ غیر مسلم قرار پانے کے بعد اپنے ڈنگ میں مزید زہر بھر رہا ہے۔ بعض سائنسی، نشری، تعلیمی، صحافتی اور انتظامی دائروں میں اچھے عہدوں پہ اس کے افراد موجود ہیں وہ آج بھی ذہن میں قادیانی حکومت کا منصوبہ لیے ہوئے ربوہ سے رہنمائی لیتے رہتے ہیں۔ بلکہ ان دنوں تو شاید ان کا اصل اڈا ہی ربوہ کے بجائے اسلام آباد میں منتقل ہو گیا ہے۔ اب اُن کو ایک اور راستہ مل گیا ہے۔ عہدہ دار قادیانیوں سے پوچھیے تو وہ انکار کر دیں گے کہ ہم قادیانی نہیں ہیں تائب ہو چکے ہیں۔ ویسے اندر خانے جماعت کے مرشد مرزا صاحب پہ اعتقاد بھی برقرار ہے۔ ربوہ سے تعلق بھی قائم ہے۔ قادیانی قادیانی کی دوستی بھی جوں کی توں ہے اور خفیہ خفیہ لٹریچر بھی حاصل کر لیتے ہیں تاکہ ایمان تازہ رہے۔

حال ہی میں عبدالسلام صاحب کو آدھا سائنسی اعزاز ملا تو دفاعی سطح سے لے کر ضلعی سطحوں تک جیب تبریکی تقریبوں کا سلسلہ شروع ہوا تو نہ صرف الفضل میں اُن کے پیرو مرشد نے عبدالسلام کی تعریف کی، بلکہ ملک بھر کے قادیانی یکایک اُبھر کر اوپر آگئے۔

ہم اگر پیشگوئی کا اذن رکھتے تو بتا دیتے کہ امریکہ وغیرہ کی اس وقت آرزو یہ ہے کہ عبدالسلام صاحب ہمارے اہم سائنسی منصوبوں، خصوصاً جوہری توانائی کے اداروں میں اونچی مسند سنبھال کے بیٹھیں، جہاں پہلے بھی ایک اہم شخصیت موجود ہے۔ خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔

ہم تو سیدھے سے عقیدے کے لوگ ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ اس گروہ کا ہمارے ہاں حاصل کردہ نفوذ نہ جانے کتنی بڑی نحوستیں ہمارے اوپر طاری کر دے گا ــــ اور وہ بھی ایسی نازک گھڑی میں!

قادیانی اگر حدود میں رہیں تو اچھا ہے، ورنہ یہاں کے عوام کو آپ نے ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء میں دیکھ

ہی ایا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کب کوئی نئی حرکت نہ پیدا ہو جائے گی۔

بہرحال مولینا سمیع الحق کی کتاب نہ صرف اسلامیات اور عالم اسلام کے کورسوں میں شامل ہونی چاہیے بلکہ موجودہ حکام کو براہ راست خود اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ پھر ان کی تحقیق احوال کے لیے ایک خفیہ ادارہ قائم کر دینا چاہیے جو ملک میں نظر رکھنے کے علاوہ ملک سے باہر جا کر کام کرنے والے قادیانیوں کی نگرانی کرتا ہے۔

ختم نبوت

مؤلفہ: حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی

صفحات: ۴۰ قیمت درج نہیں۔

ناشر: مکتبہ رازی - ۱۶۰۰ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی

مرزا صاحب کی طرف سے نبی اور مسیح موعود ہونے کے دعووں پر حافظ صاحب نے علمی انداز سے کلام کیا ہے۔ اسی سلسلے میں بحث کا اصل محور مسئلہ ختم نبوت بنا ہے۔ فاضل مرتب نے ختم نبوت کے دلائل کی روشنی میں دکھایا ہے کہ مرزا صاحب کے دعاوی باطل ہیں۔

(بقیہ محدث قرطبہ بقی بن مخلد)

تھے۔ بعض ان چار مسائل میں امام مالک کے اقوال سے اختلاف کرنے کی وجہ سے بہت سے اندلسی علماء ان کے مخالف ہو گئے تھے۔ لہٰذا اگر اندلس میں امام بقی بن مخلدؒ کی مخالفت شروع ہو گئی تھی تو یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔

(باقی)

اعتذار

ادارہ معذرت خواہ ہے کہ اس مضمون کی پہلی قسط غلطی سے جناب عبدالرشید عراقی کے نام سے شائع ہو گئی۔ قارئین پچھلے شمارے میں تصحیح کر لیں۔

(بقیہ اشارات) ایک بار وہ فلسفہ ٹوٹ جائے جو روسی نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ بخلاف اس کے اگر بزدلی اور مفاد پرستی کی راہ اختیار کی گئی تو اشتراکیت کی فکری شکست کا جو موقع آج پیدا ہوا ہے وہ ضائع چلا جائے گا۔

خاص طور سے اس مرحلے پر اہل پاکستان پر بہت ہی عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ فعالانہ اور عزیمت مندانہ اقدام کر کے اپنا تاریخی حصہ صحیح طور پر اگر ادا کر دیں تو دنیا کے لیے مستقل امن کی راہ کھل جائے گی۔ ایسے تاریخی معرکوں میں چند ہزار یا چند لاکھ جانوں کا جانا یا آبادیوں اور سڑکوں اور سرکاری عمارتوں کا تباہ ہو جانا بہت ہی معمولی بات ہے۔ کوئی بھی خارجی قوت سارے پاکستان پر اپنی فوجیں پھیلا کر بھی اگر یہ محسوس کرے کہ وہ یہاں کی آبادی کو غلام یا آلۂ کار نہیں بنا سکی ہے تو وہ چاروناچار پیچھے ہٹ کر سکڑ جائے گی۔

اُوپر جن کوششوں کا ذکر ہوا ہے، یہ اسلام سے محبت رکھنے والی ہماری اکثریت کے خلاف ایک ایسی سرد جنگ کی حیثیت رکھتی ہیں، جن کا مقصد ہمارے عزائم اور حوصلوں کو وقت سے پہلے شکست دینا ہے۔

ان سب کا توڑ صرف یہ شعور ہے کہ اسلام ایک ایسی تحریک جہاد ہے جس میں کثرت و قلت یا فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر خدا کے پرستار اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلابی سپاہی سچائی کے موقف سے باطل طاقتوں سے ہمیشہ نبرد آزما رہے ہیں۔ اس تحریک جہاد نے مکّہ کے غلاموں تک کو سردارانِ قریش کے مضبوط مشرکانہ نظام کے خلاف اُٹھا کھڑا کیا اور ۱۳ برس تک عقوبتیں سہنے کے باوجود کوئی ایک فرد بھی اپنے موقف سے نہیں ہٹا۔ بیعت عقبہ منعقد کرنے والوں نے اس حقیقت کو پا لیا کہ وہ اسود و احمر کے خلاف جنگ کا پیمان باندھ رہے ہیں۔ بدر کے میدان میں وہ تحریک ایک بڑی فوجی قوت کے مقابلے میں قلیل التعداد اور بے سروسامان سپاہ کو لائی۔ اور نتیجہ ایسا نکلا کہ پورا فلسفۂ فتح و شکست بدل گیا۔ مسلمانوں نے اپنی ساری تاریخ میں زیادہ تر جنگیں دشمن سے کم تر فوجی قوت کے ذریعے جیتیں۔

اس محمدی تحریک جہاد نے طارق و موسیٰ اور صلاح الدین ایوبیؒ اور محمد بن قاسم جیسے سپہ سالار

پیدا کیے جنھوں نے بڑی بڑی طاقتوں کو چیلنج دیا۔ اس نے مصر سے بیبرس جیسے غلام سپاہی کو دنیائے اسلام کو روندنے والے تاتاریوں کے خلاف اٹھا کھڑا کیا اور اس کے آغاز کردہ معرکے کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ تاتاریوں کا دَور ختم ہوگیا۔ اور پھر محمدی تحریکِ جہاد یہ منظر دکھاتی ہے کہ مکہ میں مشرکین حضرت خبیبؓ کو پھانسی دیتے ہیں اور حضرت زید الدثنہ کو قتل کرتے ہیں، مگر وہ نہ معافی مانگتے ہیں، نہ خوشامد کرتے ہیں۔

اسی طرح بعد میں حضرت امام حسینؓ یہ مثال قائم کرتے ہیں کہ یزید کے فاسد نظامِ حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بن کر اپنے اہلِ خانہ اور تھوڑے سے رفیقوں کے ساتھ نکلتے ہیں اور سامنے حکومت کی بھاری فوجی قوت چیلنج بن کے آتی ہے۔ آپ اپنی اور اپنے گھر والوں اور ساتھیوں کی جانیں قربان کر دیتے ہیں مگر اسلام کے صحیح موقف سے نہیں ہٹتے۔

اور آج کئی کئی سال سے اریٹیریا کے مسلمان اور فلپائن کے مسلمان بے سروسامانی کے باوجود قربانیاں دے دے کر وقت کی جابر حکومتوں کے خلاف دینی آزادی اور سیاسی حقوق کے لیے جہاد آرا ہیں۔

سچا اسلام جہاں جائے گا، اس کے ساتھ جذبۂ جہاد بھی ضرور موجود ہوگا۔

سو ایسی قوم نے اگر پاکستان اسلام کے لیے بنایا ہے اور وہ اس میں اسلامی نظام کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے تو یہ کیسے تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ کوئی ظالم قوت جارحیت کرے اور محمدؐ کی یہ قوم جہاد کرنے کے بجائے خوشامد پر اتر آئے۔

یہاں اگر ایک متنفس بھی ایمان والا ہوگا تو وہ چیتوں اور بھیڑیوں کے لشکر سے بھی لازماً لڑے گا۔ اس کی موت تاریخ میں پیغامِ جہاد بن کر دوسروں کے لیے وجہ تحریک بنے گی۔

کیا ہم لوگ افغانستانی بھائیوں سے بھی گئے گذرے ہیں، جو منظم فوج نہیں ہیں اور سازوسامان نہیں رکھتے مگر جانیں دے دے کر روس کو وہ سبق سکھا رہے ہیں جو اسے چیکوسلواکیہ اور ہنگری والے نہ سکھا سکے۔

پس ہم امتِ محمدیؐ کے لوگ اسلام کی تحریکِ جہاد کے سپاہی ہیں اور پاکستان کی تشکیل سے ہمارا مقصد ہی اپنے جداگانہ دینی و تہذیبی نظام کو برسرِ عمل لانا ہے۔ اس خطے کو ہم اس کے مقصد کی وجہ سے ایک مسجد کی طرح اس بات کا حق دار مانتے ہیں کہ اس کے لیے ہم پہاڑوں اور وادیوں اور میدانوں اور ریگستانوں میں لڑیں اور خون کا ایک ایک قطرہ پیش کردیں۔

ہمارے اوپر اپنے تحفظ کے علاوہ عالمِ اسلام کے ایک بڑے حصے کے تحفظ کی ذمہ داری بھی آتی ہے۔ اگر ہم کسی ظالم قوت کی مزاحمت نہ کرسکے تو ہمارے علاوہ بہت سے مسلم ممالک تباہی کا لقمہ بن جائیں گے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

کے خلاف

ذاتی اور شخصی، مذہبی اور سیاسی الزامات کا تجزیہ

مولانا مودودیؒ پر جھوٹے الزامات

اور

اُن کے مُدلّل جوابات

تالیف

عاصم نعمانی

•

• سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ • ضخامت: ۱۲۸ صفحات • قیمت: پانچ روپے

•

ناشر: مجلس احباب، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

•

ملنے کا پتہ

- ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور
- مکتبہ تعمیر انسانیت۔ اردو بازار لاہور
- اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکیٹ لاہور
- پین اسلامک پبلشرز، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور
- ادارہ مطبوعات طلبہ، اچھرہ، لاہور
- شیخ فقیر حسین صاحب، منصورہ ملتان روڈ لاہور
- مکتبۂ افکار اسلامی، بازار شاہ فیصل شہید، راولپنڈی
- البدر بک کارپوریشن، صدر، کراچی۔